جلال سے پیدا ہوا اور جس کا تقاضہ یہ ہو کہ وہ ہر حال میں اس کی رضا جوئی کی فکر کرے اور ناراضی کے شبہہ سے بھی بچتا رہے۔ یہی وہ چیز ہے جو انسان کو عبد کامل اور مقبول بنانے والی ہے۔ (معارف القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الزلزال (99)

آیت نمبر (1تا8)

ترکیب

(آیت۔1تا3) بات اِذَا سے شروع ہو رہی ہے اس لیے ان آیات میں آنے والے افعال ماضی کا ترجمہ مستقبل میں ہوگا۔ (آیت۔4) تُحَدِّثُ کا مفعول اَخۡبَارَھَا بنفسہٖ آیا ہے۔ اس حوالے سے نوٹ کر لیں کہ حَدَّثَ کا مفعول بِ کے صلہ کے ساتھ بھی آتا ہے اور بنفسہٖ بھی آتا ہے۔ (آیت۔5) قرآن مجید میں تقریباً ہر جگہ اَوۡحٰی کا مفعول الٰی کے صلہ کے ساتھ آیا ہے۔ یہ واحد مقام ہے جہاں اس کی ضمیر مفعولی ھَا کے ساتھ لام کا صلہ آیا ہے۔ (آیت۔6) اَشۡتَاتًا حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ یَرَوۡا مضارع مجہول ہے جو ثلاثی مجرد اور باب افعال میں ہم شکل ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہاں ان میں پہچان کا ایک قرینہ موجود ہے۔ رءی۔ یَرٰی (ثلاثی مجرد) کا ایک مفعول آتا ہے، کسی کو دیکھا۔ جبکہ اَرٰی۔ یُرِیۡ (باب افعال) کے دو مفعول آتے ہیں، کس کو دکھایا اور کیا دکھایا۔ یہاں یُرَوۡا میں شامل ھم کی ضمیر نائب فاعل (یعنی مفعول اوّل) موجود ہے۔ آگے اَعۡمَالَھُمۡ اس کا مفعول ثانی آیا ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ یہاں یُرَوۡا بابِ افعال کا مضارع مجہول ہے۔ (آیت۔7) مَنۡ شرطیہ ہے۔ اس لیے یَعۡمَلۡ مجزوم آیا ہے۔ یَرٰی جواب شرط ہونے کی وجہ سے مجزوم ہوا تو اس کی یا گر گئی۔ ترجمہ جملہ شرطیہ کے لحاظ سے ہوگا۔ یَعۡمَلۡ کا مفعول خَیۡرًا ہے جو نکرہ مخصوصہ ہے۔ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ اس کی خصوصیت مقدم ہے۔

ترجمہ

اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ	زِلۡزَالَھَا ۙ﴿۱﴾	وَ اَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ	اَثۡقَالَھَا ۙ﴿۲﴾
جب ہلا یا جائے گا زمین کو	جیسے اس کو ہلا مارنے کا حق ہے	اور نکال ڈالے گی زمین	اپنے سارے بوجھ

وَ قَالَ الۡاِنۡسَانُ	مَا لَھَا ۚ﴿۳﴾	یَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ	اَخۡبَارَھَا ۙ﴿۴﴾	بِاَنَّ رَبَّکَ
اور کہے گا انسان	اس کو کیا (ہو گیا) ہے	اُس دن وہ بیان کرے گی	اپنی خبریں	(یہ) اس سبب سے کہ آپؐ کے رب نے

اَوۡحٰی لَھَا ؕ﴿۵﴾	یَوۡمَئِذٍ یَّصۡدُرُ النَّاسُ	اَشۡتَاتًا ۬ۙ	لِّیُرَوۡا	اَعۡمَالَھُمۡ ؕ﴿۶﴾
الہام کیا اس کو	اس دن واپس ہوں گے لوگ	الگ الگ ہوتے ہوئے	تا کہ ان لوگوں کو دکھایا جائے	ان کا سب کیا دھرا

فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ	مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا	یَّرَہٗ ؕ﴿۷﴾	وَ مَنۡ یَّعۡمَلۡ
پس جس نے (بھی) عمل کیا	کسی ذرہ کے ہم وزن کسی بھلائی کا	تو وہ دیکھ لے گا اس کو	اور جس نے (بھی) عمل کیا

مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا	یَّرَہٗ ٪﴿۸﴾
کسی ذرہ کے ہم وزن کسی برائی کا	تو وہ دیکھ لے گا اس کو

نوٹ:1 اس میں اختلاف ہے کہ یہاں جس زلزلہ کا ذکر ہے، یہ وہ زلزلہ ہے جو نفخہ اولی (پہلا صور پھونکے جانے) سے پہلے دنیا

میں ہوگا، جیسا کہ علاماتِ قیامت میں ذکر آیا ہے۔ یا اس زلزلہ سے مراد وہ زلزلہ ہے جو دوسرا صور پھونکے جانے کے بعد ہوگا جب مُردے زندہ ہوکر اٹھیں گے۔ مفسرین کے اقوال مختلف ہیں لیکن آگے احوال قیامت اور حساب کتاب کا ذکر ہے، وہ قرینہ اسی کا ہے کہ یہ زلزلہ دوسرا صور پھونکے جانے کے بعد کا ہے۔ (معارف القرآن)۔

2029

اس وقت زمین جو کچھ اس کے پیٹ میں ہے مثلاً مُردے یا سونا چاندی وغیرہ، سب کچھ باہر اگل ڈالے گی لیکن اس وقت مال کا کوئی لینے والا نہ ہوگا۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ زمین اپنے جگر کے ٹکڑے بڑی چٹانوں کی صورت میں اُگل دے گی۔ اس وقت ایک شخص جس نے مال کے لیے کسی کو قتل کیا تھا وہ دیکھ کر کہے گا۔ یہ وہ چیز ہے جس کے لیے میں نے اتنا بڑا جرم کیا تھا۔ جس شخص نے اپنے رشتہ داروں سے مال کی وجہ سے قطع تعلق کیا تھا وہ کہے گا یہ ہے وہ چیز جس کے لیے میں نے یہ حرکت کی تھی چوری کی سزا میں جس چور کا ہاتھ کاٹا گیا تھا وہ کہے گا اس کے لیے میں نے اپنا ہاتھ گنوایا تھا۔ پھر کوئی بھی اس سونے کی طرف التفات نہ کرے گا۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔4۔ کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ حالات یہ ہیں کہ زمین ہر بندے اور بندی کے بارے میں اس عمل کی گواہی دے گی جو اس کی پیٹھ پر اس نے کیا ہوگا۔ وہ کہے گی کہ اس نے فلاں دن فلاں کام کیا تھا۔ یہ ہیں وہ حالات جو زمین بیان کرے گی۔

زمین کے متعلق یہ بات کہ وہ قیامت کے روز اپنے اوپر گزرے ہوئے سب حالات و واقعات بیان کرے گی، قدیم زمانے کے آدمی کے لیے بڑی حیران کُن ہوگی کہ آخر زمین کیسے بولنے لگے گی، لیکن آج علوم طبعی کے انکشافات اور سینما، ریڈیو، ٹیلیویژن، ٹیپ ریکارڈر، الیکٹرانکس وغیرہ ایجادات کے اس دور میں یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ زمین اپنے حالات کیسے بیان کرے گی۔ انسان اپنی زبان سے جو کچھ بولتا ہے اس کے نقوش ہوا میں، ریڈیائی لہروں میں اور مختلف جگہوں کے ذرات میں ثبت ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس وقت چاہے ان ساری آوازوں کو ٹھیک اسی طرح ان چیزوں سے دہروا سکتا ہے جس طرح کبھی وہ انسان کے منہ سے نکلی تھیں۔ پھر انسان نے زمین پر جہاں بھی کوئی کام کیا ہے اس کی ایک ایک حرکت کا عکس اس کے گردوپیش کی تمام چیزوں پر پڑا ہے اور اس کی تصویر ان پر نقش ہو چکی ہے۔ بالکل گھپ اندھیرے میں بھی اس نے کوئی فعل کیا ہو تو خدا کی خدائی میں ایسی شعاعیں موجود ہیں جن کے لیے اندھیرا اور اُجالا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وہ ہر حالت میں اس کی تصویر لے سکتی ہیں۔ یہ ساری تصوریں قیامت کے روز ایک متحرک فلم کی طرح انسان کے سامنے آجائیں گی۔

اگرچہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کے اعمال کو براہِ راست خود جانتا ہے، مگر آخرت میں جب وہ عدالت قائم کرے گا تو جس کو بھی سزا دے گا، انصاف کے تمام تقاضے پورے کر کے دے گا۔ اس کی عدالت میں ہر مجرم انسان کے خلاف جو مقدمہ قائم کیا جائے گا، اس کو ایسی مکمل شہادتوں سے ثابت کر دیا جائے گا کہ اس کے مجرم ہونے میں کسی کلام کی گنجائش باقی نہ رہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3

آیت۔7۔ میں خیر سے مراد وہ خیر ہے جو شرعاً معتبر ہے یعنی جو ایمان کے ساتھ ہو۔ بغیر ایمان کے کوئی نیک عمل اللہ کے نزدیک نیک نہیں یعنی آخرت میں ایسے نیک عمل کا جو حالت کفر میں کیا گیا تھا، کوئی اعتبار نہیں ہوگا، گو دنیا میں اس کو اس کا بدلہ دے دیا جائے۔ اسی لیے اس آیت سے اس پر استدلال کیا گیا ہے کہ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہوگا وہ بالآخر جہنم سے نکال لیا جائے گا۔ کیونکہ اس آیت کے وعدے کے مطابق اس کو اپنی نیکی کا پھل بھی آخرت میں ملنا ضروری ہے۔ اگر اور کوئی نیکی نہ ہو تو خود ایمان بہت بڑی نیکی ہے۔ اگلی آیت میں شر سے مراد وہ شر ہے جس سے اپنی زندگی میں توبہ نہ کر لی ہو، کیونکہ توبہ سے گناہوں کا معاف ہونا قرآن وسنت میں یقینی طور پر ثابت ہے۔ البتہ جس گناہ سے توبہ نہ کی گئی ہو وہ چھوٹا ہو یا بڑا، آخرت میں اس کا نتیجہ ضرور سامنے آئے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایسے گناہوں سے بچنے کا پورا اہتمام کرو جن کو چھوٹا یا حقیر سمجھا جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر بھی مواخذہ ہونا ہے۔ (معارف القرآن)۔

2029

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ العٰدیٰت (100)

آیت نمبر (1 تا 11)

ض ب ح

(ف) ضَبۡحًا دوڑتے ہوئے سینے سے آواز نکالنا۔ ہانپنا۔ زیر مطالعہ آیت۔1۔

ق د ح

(ف) قَدۡحًا دو چیزوں کو رگڑ کر آگ نکالنا، زیر مطالعہ آیت۔2۔

ن ق ع

(ف) نَقۡعًا کسی جگہ پانی کا جمع ہو کر ٹھہر جانا۔ گرد و غبار کا گر کر بیٹھ جانا۔
نَقۡعٌ اسم ذات بھی ہے۔ گرد و غبار۔ ٹھہرا ہوا پانی۔ زیر مطالعہ آیت۔4۔

ک ن د

(ن) کُنُوۡدًا زمین کا بنجر ہونا۔ انسان کا ناشکری کرنا۔
کَنُوۡدٌ فَعُوۡلٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔ نعمتوں کو بھولنے والا اور مصائب کو شمار کرنے والا۔ انتہائی ناشکرا۔ زیر مطالعہ آیت۔6۔

ح ص ل

(ن) حُصُوۡلًا حاصل ہونا۔ باقی رہنا۔
(تفعیل) تحصیلًا حاصل کرنا، ظاہر کرنا، کان سے سونا، چاندی یا دوسری معدنیات نکالنا۔ کسی چیز کا چھلکا اتار کر گودہ نکالنا۔ (زیر مطالعہ آیت۔10)

ترکیب

عربی میں عام طور پر گھوڑوں کے لیے جمع مؤنث کے صیغے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان آیات میں جمع مؤنث کے صیغوں کا ترجمہ اردو محاورے کے مطابق جمع مذکر میں کیا جائے گا، (آیت۔1) ضَبۡحًا حال ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ (آیت۔2) قَدۡحًا مصدر ہے اور اس میں رگڑ کر آگ جلانے کا مفہوم ہے۔ جبکہ اَلۡمُوۡرِیٰتِ مادہ وری سے باب افعال میں اسم الفاعل ہے۔ اس میں بھی رگڑ کر آگ جلانے والے کا مفہوم ہے۔ یہ دونوں ہم معنی ہونے کی وجہ سے بہتر ہے کہ قَدۡحًا کو مُوۡرِیَات کا مفعول مطلق مانا جائے۔ (حافظ احمد یار صاحب)۔ اَلۡمُوۡرِیٰتِ کو حالتِ نصب میں ماننے کی کوئی وجہ یا قرینہ یہاں موجود نہیں ہے۔ اس لیے اس کو پہلی آیت کے

واوقسمیہ پر عطف مان کر حالتِ جرّ میں مانا جائے گا۔ ضَبۡحًا ظرف ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔(آیت۔4۔5)۔ اَثَرۡنَ اور وَسَطۡنَ فعل ماضی میں جمع مؤنث کے صیغے ہیں۔لیکن ان میں آفاقی صداقت یعنی گھوڑوں کی مستقل خصلت کا بیان ہے اس لیے ان کا ترجمہ حال میں ہوگا۔(دیکھیں آیت۔2/البقرہ:49،نوٹ۔2)۔ نَقۡعًا اور جَمۡعًا بالترتیب اَثَرۡنَ اور وَسَطۡنَ کے مفعول ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہیں۔

ترجمہ

وَالۡعٰدِیٰتِ ضَبۡحًا ﴿۱﴾	فَالۡمُوۡرِیٰتِ	قَدۡحًا ﴿۲﴾
قسم ہے ہانپتے ہوئے تیز دوڑنے والوں (گھوڑوں) کی	پھر قسم ہے رگڑ سے آگ نکالنے والوں کی	جیسا رگڑنے کا حق ہے

فَالۡمُغِیۡرٰتِ صُبۡحًا ﴿۳﴾	فَاَثَرۡنَ بِہٖ	نَقۡعًا ﴿۴﴾	فَوَسَطۡنَ بِہٖ
پھر قسم ہے صبح کے وقت غارتگری کرنے والوں کی	پھر وہ اٹھاتے ہیں اُس (وقت) میں	گرد وغبار کو	پھر وہ درمیان میں گھس جاتے ہیں اس وقت

جَمۡعًا ﴿۵﴾	اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لِرَبِّہٖ	لَکَنُوۡدٌ ﴿۶﴾	وَ اِنَّہٗ عَلٰی ذٰلِکَ	لَشَہِیۡدٌ ﴿۷﴾
کسی جماعت کے	بیشک انسان اپنے رب کے لیے	یقیناً انتہائی ناشکرا ہے	حالانکہ بیشک وہ اس (بات) پر	یقیناً معائنہ کرنے والا ہے

وَ اِنَّہٗ لِحُبِّ الۡخَیۡرِ	لَشَدِیۡدٌ ﴿۸﴾	اَفَلَا یَعۡلَمُ	اِذَا بُعۡثِرَ	مَا فِی الۡقُبُوۡرِ ﴿۹﴾
اور بیشک وہ مال کی محبت کے لیے	یقیناً بہت سخت ہے	تو کیا وہ جانتا نہیں (اُس وقت کو)	جب کریدا جائے گا	اس کو جو قبروں میں ہے

وَ حُصِّلَ مَا	فِی الصُّدُوۡرِ ﴿۱۰﴾	اِنَّ رَبَّہُمۡ بِہِمۡ	یَوۡمَئِذٍ لَّخَبِیۡرٌ ﴿۱۱﴾
اور حاصل کرلیا جائے گا اس کو جو	سینوں میں ہے	بیشک ان کا رب ان کے بارے میں	اس دن یقیناً خبر رکھنے والا ہے

نوٹ:1

قرآن مجید جس چیز کی قسم کھا کر کوئی مضمون بیان فرماتا ہے تو اس چیز کو اس مضمون کے ثبوت میں دخل ہوتا ہے۔ یہاں جنگی گھوڑوں کی خدمات کا ذکر اس بات کی شہادت میں لایا گیا ہے کہ انسان بڑا ناشکرا ہے۔ تشریح اس کی یہ ہے کہ جنگی گھوڑے میدان جنگ میں انسان کے حکم اور اشارے کے تحت اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر کیسی کیسی سخت خدمات انجام دیتے ہیں۔ حالانکہ انسان نے ان گھوڑوں کو پیدا نہیں کیا۔ انسان ان کو جو گھاس، دانہ وغیرہ دیتا ہے وہ بھی اس کا پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔ اس کا کام صرف اتنا ہے کہ اللہ کے پیدا کیے ہوئے رزق کو ان تک پہنچانے کا ایک واسطہ بنتا ہے۔ اب گھوڑے کو دیکھیں کہ وہ انسان کے اتنے سے احسان کو کیسا پہچانتا اور مانتا ہے کہ اس کے ایک اشارے پر اپنی جان کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ اس کے بالمقابل انسان ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ایک حقیر قطرے سے پیدا کیا، اس کو مختلف کاموں کی قوت بخشی، اس کے کھانے پینے کی ہر چیز پیدا فرمائی اور اس کی تمام ضروریات کو اس تک پہنچا دیا مگر وہ ان تمام احسانات کا شکرگزار بننے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:2

یہاں انسان کے متعلق دو باتیں کہی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ تکلیفوں کو یاد رکھتا ہے اور نعمتوں اور احسانات کو بھول جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ مال کی محبت میں شدید ہے۔ یہ دونوں باتیں شرعاً اور عقلاً مذموم ہیں۔ ناشکری کا مذموم ہونا تو بالکل ظاہر ہے لیکن مال کی محبت کو بھی مذموم قرار دیا گیا ہے حالانکہ اس پر انسانی ضروریات کا مدار ہے اور اس کے کسب واکتساب کو شریعت نے صرف حلال ہی نہیں بلکہ بقدر ضرورت فرض قرار دیا ہے۔ تو مال کی محبت کا مذموم ہونا اس اعتبار سے ہے کہ انسان مال کی محبت سے اتنا مغلوب ہو جائے کہ اللہ کے احکام سے غافل ہو جائے اور

حلال وحرام کی پروانہ رہے۔ اس لیے مال کو کمانا اور بقدر ضرورت جمع کرنا تو مذموم نہیں بلکہ فرض ہے لیکن دل میں اس کی محبت ہونا مذموم ہے۔ جیسے انسان بیماری میں دوا بھی پیتا ہے، آپریشن بھی کراتا ہے مگر دل میں ان چیزوں کی محبت نہیں ہوتی بلکہ بدرجۂ مجبوری اور بقدر ضرورت کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ کے نزدیک مومن کو ایسا ہونا چاہیے کہ بقدر ضرورت مال کو حاصل بھی کرے، اس کی حفاظت بھی کرے اور ضرورت پر اس سے کام بھی لے مگر دل اس کے ساتھ مشغول نہ ہو۔ جیسا کہ مولانا رومیؒ نے فرمایا: کہ پانی جب تک کشتی کے نیچے رہے تو وہ کشتی کا مددگار ہے مگر یہی پانی جب کشتی کے اندر آجائے تو کشتی کو لے ڈوبتا ہے۔ اسی طرح مال جب تک دل کی کشتی کے اردگرد ہے تو مفید ہے لیکن جب دل کے اندر گھس گیا تو ہلاکت ہے۔ (معارف القرآن)۔

مال و دولت کے متعلق اسلام کا یہ وہ متوازن طرز فکر اور طرز عمل ہے جو ہمارے پروردگار کو مطلوب ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس کو بیان کرنا اور اس کی تلقین کرنا جتنا آسان ہے، اس کو اپنانا اور لائف اسٹائل بنانا اتنا ہی مشکل ہے۔ یہ اس دنیا کا پل صراط ہے، بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز۔ کوئی مائی کا لعل گزر نہیں سکتا، اللہ اگر توفیق نہ دے۔ اس لیے اسی کے آگے گڑگڑاتے رہنا چاہیے، اسی سے توفیق و تائید مانگتے رہنا چاہیے۔ یہ لائف اسٹائل اختیار کرنا نسبتاً آسان ہے۔ اور اللہ جب اس راہ کا راہی بنائے تو پھر کہہ دینا چاہیے ﴿حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۲۹﴾﴾ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص صبح اور شام اس آیت کو سات سات بار پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس کو دین اور دنیا کی فکروں سے نجات دے دے گا۔ (حدیث منقول از صحیفۂ اہل حدیث، ۷۔ جنوری ۲۰۱۱ء۔ مرتب)۔

نوٹ:3 آیت۔10۔ کا مطلب یہ ہے کہ ظاہری افعال کے پیچھے جو باطنی محرکات (MOtives) چھپے ہوئے ہیں وہ سب کھول کر رکھ دیئے جائیں گے اور ان کی جانچ پڑتال کر کے اچھائی برائی کو الگ الگ کر دیا جائے گا۔ یعنی فیصلہ صرف ظاہر ہی کو دیکھ کر نہیں کیا جائے گا کہ انسان نے عملاً کیا کچھ کیا۔ بلکہ دلوں میں چھپے ہوئے رازوں کو نکال کر دیکھا جائے گا کہ انسان نے جو کام کیے وہ کس نیت اور کس غرض سے کیے۔ اس بات پر اگر انسان غور کرے تو وہ یہ تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اصلی اور مکمل انصاف خدا کی عدالت کے سوا اور کہیں نہیں ہو سکتا۔ دنیا کے لادینی قوانین بھی اصولی حیثیت سے ضروری سمجھتے ہیں کہ کسی شخص کے محض ظاہری فعل کی بنا پر اسے سزا نہ دی جائے بلکہ یہ بھی دیکھا جائے کہ اس نے کس نیت سے وہ فعل کیا۔ لیکن دنیا کی کسی عدالت کے پاس وہ ذرائع نہیں ہیں جن سے وہ نیت کی ٹھیک ٹھیک تحقیق کر سکے۔ یہ صرف اور صرف خدا ہی کر سکتا ہے کہ الفاظ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ فیصلہ محض اللہ کے اس علم کی بنا پر نہیں ہوگا جو وہ دلوں کے ارادوں اور نیتوں کے بارے میں پہلے ہی سے رکھتا ہے، بلکہ قیامت کے روز ان رازوں کو کھول کر سامنے رکھ دیا جائے گا اور کھلی عدالت میں یہ دکھایا جائے گا کہ ان میں خیر کیا تھی اور شر کیا تھا۔ (تفہیم القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سورۃ القارعۃ (101)

آیت نمبر (1 تا 8)

وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡقَارِعَةُ ؕ ﴿۳﴾	مَا الۡقَارِعَةُ ۚ ﴿۲﴾	اَلۡقَارِعَةُ ۙ ﴿۱﴾
اور تو نے کیا سمجھا کیا ہے کھٹکھٹانے والی	کیا ہے کھٹکھٹانے والی	کھٹکھٹانے والی

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ	كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۙ﴿۴﴾	وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ
جس دن ہو جائیں گے لوگ	بکھیرے ہوئے پتنگوں کی مانند	اور ہو جائیں گے سارے پہاڑ

كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ؕ﴿۵﴾	فَاَمَّا مَنْ	ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ﴿۶﴾	فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ؕ﴿۷﴾
دُھنی ہوئی رنگین اون کی مانند	پس وہ جو ہے	بھاری ہوئے جس کے ترازو (پلڑے)	تو وہ من بھاتی زندگی گزارنے میں ہے

وَاَمَّا مَنْ	خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ﴿۸﴾	فَاُمُّهٗ
اور وہ جو ہے	ہلکے ہوئے جس کے ترازو (پلڑے)	تو اس کی ماں (گود)

هَاوِيَةٌ ؕ﴿۹﴾	وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ؕ﴿۱۰﴾	نَارٌ حَامِيَةٌ ﴿۱۱﴾
ایک نیچے اترنے والی (جگہ۔گڑھا) ہے	اور تونے سمجھا کیا ہے وہ (جگہ)	(وہ) ایک دہکنے والی آگ ہے

نوٹ:1

قَارِعَۃٌ کا لفظی ترجمہ ہے ٹھونکنے والی۔ یہ لفظ ہولناک حادثہ اور بڑی بھاری آفت کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہاں یہ لفظ قیامت کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور اِن آیات میں قیامت کے پہلے مرحلے سے لے کر عذاب وثواب کے آخری مرحلے تک کو یک جا کر دیا گیا ہے۔ پہلی پانچ آیات میں قیامت کے پہلے مرحلے کا ذکر ہے جب وہ حادثۂ عظیم (اَلْقَارِعَۃُ) برپا ہوگا جس کے نتیجے میں دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اس وقت لوگ گھبراہٹ کے عالم میں اس طرح بھاگے پھریں گے جیسے روشنی پر آنے والے پروانے ہر طرف پراگندہ ومنتشر ہوتے ہیں اور پہاڑ دھنکے ہوئے اُون کی طرح ہوں گے۔ پھر اگلی آیات میں اس مرحلے کا ذکر ہے جب دوبارہ زندہ ہو کر لوگ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہوں گے۔ (تفہیم القرآن)۔

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۙ﴿۴﴾ کا ایک مطلب یہ بھی لیا گیا ہے کہ یہ اس وقت کی کیفیت کا بیان ہے جب لوگ دوبارہ زندہ ہو کر قبروں سے نکلیں گے۔ لیکن اگلی آیت میں پہاڑوں کی جس کیفیت کا بیان ہے اس کی بنیاد پر یہ رائے زیادہ قرین قیاس نہیں ہے۔ (مرتب)۔

اعمال کے وزن کی وضاحت الاعراف کی آیات۔8۔9۔ کے نوٹ۔2 میں کی جا چکی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ التکاثر (102)

آیت نمبر (1 تا 8)

ترکیب

(آیت۔1) تَکَاثُرُ باب تفاعل کا مصدر ہے اس لیے اس میں باہم ایک دوسرے پر کثرت حاصل کرنے کا مفہوم شامل ہے۔ اور یہ اَلْھٰی کا فاعل ہونے کی وجہ سے حالتِ رفع میں ہے۔ جس چیز میں کثرت کی خواہش نے انسان کو غافل کیا وہ یہاں محذوف ہے اس لیے اس کے مفہوم میں وسعت ہے۔ دنیوی ساز وسامان نے جس چیز سے انسان کو غافل کیا وہ بھی محذوف ہے۔ جو آخرت بھی ہوسکتی ہے، ذکر اللہ بھی ہوسکتا ہے۔

(آیت۔7) تَعْلَمُوْنَ کا مفعول ہونے کی وجہ سے عِلْمَ الْیَقِیْنِ حالتِ نصب میں ہے۔ ثُمَّ لَتَرَوُنَّ کا مفعول ھَا ضمیر ہے

اور عَيۡنَ الۡيَقِيۡنَ حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ عِلۡمَ الۡيَقِيۡنِ اور عَيۡنَ الۡيَقِيۡنِ دونوں مرکب اضافی ہیں لیکن اضافت کے ساتھ ترجمہ کرنے سے ان اصطلاحات کا مفہوم واضح نہیں ہوتا اس لیے ان کا ترجمہ اردو محاورے کے مطابق ہوگا۔ (آیت۔8) اَلنَّعِيۡمِ پر لام جنس ہے۔

ترجمہ

اَلۡهٰكُمُ	التَّكَاثُرُ ۱	حَتّٰى زُرۡتُمُ
غافل کیا تم لوگوں کو (اللہ کی یاد سے)	ایک دوسرے پر کثرت کرنے نے (دنیوی سامان میں)	یہاں تک کہ زیارت کی تم لوگوں نے

الۡمَقَابِرَ ۲	كَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۳	ثُمَّ كَلَّا	سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ۴
قبرستانوں کی	ہرگز نہیں! عنقریب جان لوگے	پھر (مکرر) ہرگز نہیں!	عنقریب تم لوگ جان لوگے

كَلَّا لَوۡ تَعۡلَمُوۡنَ	عِلۡمَ الۡيَقِيۡنِ ۵	لَتَرَوُنَّ الۡجَحِيۡمَ ۶
ہرگز نہیں! کاش تم لوگ جانتے ہوتے	(بتائے ہوئے) علم پر یقین (کی اہمیت) کو	(تو اب) تم لوگ لازماً دیکھو گے دوزخ کو

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا	عَيۡنَ الۡيَقِيۡنِ ۷	ثُمَّ لَتُسۡـَٔلُنَّ يَوۡمَئِذٍ	عَنِ النَّعِيۡمِ ۸
پھر تم لوگ لازماً دیکھو گے اس کو	دیکھنے پر یقین کرتے ہوئے	پھر تم سے لازماً پوچھا جائے گا اس دن	تمام نعمتوں کے بارے میں

نوٹ:1 تکاثر کا مطلب ہے کثرت کے ساتھ مال و دولت جمع کرنا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ سورۃ پڑھ کر فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ مال کو ناجائز طریقوں سے حاصل کیا جائے اور مال پر جو فرائض اللہ کے عائد ہوئے ہیں ان میں خرچ نہ کریں۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:2 مسجد خالد، لاہور کے پہلے خطب کرنل اختر مرحوم نے ایک مثال کے ذریعے علم الیقین اور عین الیقین کا فرق اس طرح واضح کیا کہ ایک عام آدمی بھی بڑی آسانی سے اس کو سمجھ لیتا ہے۔ مثال یہ ہے کہ دو آدمی بازار سے ہو کر اپنے گھر جا رہے تھے۔ کسی نے ان کو اطلاع دی کہ اس راستے پر آگے تمہارا دشمن بیٹھا ہے۔ اس راستے سے مت جاؤ۔ ایک آدمی نے اس اطلاع پر یقین کر لیا اور راستہ بدل کر بخیرت پہنچ گیا۔ دوسرے آدمی نے یقین نہیں کیا۔ آگے جا کر جب وہ دشمن کے ہتھے چڑھ گیا تب اس کو یقین آیا اس مثال میں ایک اَن دیکھی حقیقت کا علم دونوں کو دیا گیا۔ پہلے آدمی نے اس علم پر یقین کر لیا۔ اس کو علم الیقین کہتے ہیں۔ اس کا سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ اس علم سے فائدہ اٹھانے یا کسی خطرے سے بچاؤ کرنے کے لیے عمل کرنے کا موقع باقی رہتا ہے۔ دوسرے آدمی نے علم پر یقین نہیں کیا۔ آگے جا کر جب اس کو دشمن نظر آیا تو اس کو یقین آ گیا۔ اس کو عین الیقین تو حاصل ہو جائے گا لیکن اس کا فائدہ کوئی نہیں ہوگا۔ اس حوالہ سے اس بات کو ذہن نشین کر لیں کہ سارا اجر و ثواب علم الیقین پر ہے اور اسی کا دوسرا نام ایمان بالغیب ہے۔ جدید تعلیم یافتہ کچھ لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ایمان بالغیب کا مطالبہ غیر فطری ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مطالبہ فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے کیونکہ غیب پر ایمان لانے کی صلاحیت انسان کی فطرت میں ودیعت شدہ (Inbuilt) ہے۔ اس کی تشریح آیت۔2/ البقرۃ:3، نوٹ۔2 میں کی جا چکی ہے۔

2029

2029

2029

2029

2029

2029

2029

2029

2050

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ العصر (103)

آیت نمبر (1 تا 3)

ترجمہ

اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا	اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ﴿۲﴾	وَ الۡعَصۡرِ ۙ﴿۱﴾
سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے	بیشک تمام انسان یقیناً خسارے میں ہیں	قسم ہے زمانے کی

وَ تَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ﴿۳﴾	وَ تَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۬ۙ	وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
اور باہم تاکید کی ثابت قدم رہنے کی	اور باہم تاکید کی اس حق (دین) کی	اور انہوں نے عمل کیے نیکیوں کے

نوٹ:1

العصر (زمانہ) لفظ گزرے ہوئے زمانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور گزرتے ہوئے زمانے کے لیے بھی جسے حال کہتے ہیں۔ گزرے ہوئے زمانے کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ انسانی تاریخ اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ جو لوگ بھی اِن صفات سے خالی تھے وہ بالآخر خسارے میں پڑ کر رہے۔ اور گزرتے ہوئے زمانے کی قسم کا مطلب سمجھنے کے لیے پہلے یہ بات سمجھ لیں کہ جو زمانہ اب گزر رہا ہے یہ دراصل وہ وقت ہے جو ہر ایک شخص کو دنیا میں کام کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔ اس کی مثال اس وقت کی سی ہے جو امتحان کے کمرے میں طالب علم کو پرچے حل کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ یہ وقت جس تیز رفتاری سے گزر رہا ہے اس کا اندازہ تھوڑی دیر کے لیے اپنی گھڑی میں سیکنڈ کی سوئی کو حرکت کرتے ہوئے دیکھنے سے آپ کو ہو جائے گا۔ پس گزرتے ہوئے زمانے کی قسم کھا کر جو بات اس سورہ میں کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ تیز رفتار زمانہ شہادت دے رہا ہے کہ ان چار صفات سے خالی ہو کر انسان جن کاموں میں بھی اپنی مہلت عمر صرف کر رہا ہے وہ سب کے سب خسارے کے سودے ہیں۔ نفع میں صرف وہ لوگ ہیں جو ان چاروں صفات سے متصف ہو کر دنیا میں کام کریں۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

اس سورہ میں خسارے سے بچنے کے لیے جن چار صفات کا ذکر ہے وہ یہ ہیں ایمان۔ عملِ صالح۔ تواصی بالحق۔ تواصی بالصبر۔ ان میں ایمان اور عمل صالح خود انسان کی ذات سے متعلق ہیں۔ ان کا معاملہ واضح ہے اور کسی تشریح کا محتاج نہیں، البتہ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر قابل غور ہیں۔ تواصی کا لفظ وصیت سے بنا ہے۔ کسی شخص کو تاکید کے ساتھ مؤثر انداز میں نصیحت کرنے کا نام وصیت ہے۔ اسی وجہ سے مرنے والا اپنے بعد کے لیے جو ہدایات دیتا ہے اس کو بھی وصیت کہا جاتا ہے۔ لفظ حق اور صبر کے معنی میں ایک احتمال یہ ہے کہ حق سے مراد صحیح عقائد اور اعمال صالحہ کا مجموعہ ہو اور صبر سے مراد تمام گناہوں اور بُرے کاموں سے بچنا ہو۔ ایسی صورت میں حق کا حاصل امر بالمعروف ہو گیا اور صبر کا حاصل نہی عن المنکر ہو گیا، یعنی وہ ایمان اور عمل صالح جس کو انسان نے خود اختیار کیا ہے اس کی تاکید اور نصیحت دوسروں کو کرنا۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ حق سے مراد صحیح اعتقادات لیے جائیں اور صبر کے مفہوم میں تمام نیک اعمال کی پابندی اور بُرے کاموں سے بچنا شامل ہو۔ حافظ ابن تیمیہ کے ایک رسالے کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ تواصی بالحق سے مراد دوسرے مسلمانوں کی علمی اصلاح ہے اور تواصی بالصبر سے مراد عملی اصلاح ہے۔

اس لحاظ سے اس سورہ میں مسلمانوں کو ایک بہت بڑی ہدایت دی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کا اپنے عمل کو قرآن وسنت کے تابع کر لینا جتنا اہم اور ضروری ہے اتنا ہی اہم اور ضروری یہ بھی ہے کہ دوسرے مسلمانوں کو بھی ایمان اور عمل صالح کی طرف بلانے کی مقدور بھر کوشش

2050
کرے ورنہ صرف اپنا عمل نجات کے لیے کافی نہ ہوگا۔ خاص طور سے اپنے اہل وعیال، متعلقین اور احباب کے بُرے اعمال سے غفلت برتنا اپنی نجات کا راستہ بند کرنا ہے، اگر چہ خود وہ کیسے ہی اعمال صالحہ کا پابند ہو۔ اس معاملہ میں عام مسلمان بلکہ بہت سے خواص تک غفلت میں مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس ہدایت پر عمل کی توفیق نصیب فرمادے۔ (معارف القرآن)۔

آج (۱۴۳۲ھ۔ ۲۰۱۱ء) کے پاکستانی معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ یہ معاملہ اب غفلت برتنے سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو، اور اس میں بھی خاص طور سے نہی عن المنکر کو ہم لوگ دوسروں کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی سمجھ کر معیوب سمجھتے رہے۔ پھر جب بات اس سے بھی آگے بڑھی تو پہیہ اُلٹا گھومنا شروع ہو گیا۔ یعنی اب ہم لوگ نہی عن المنکر کے فریضے کو نہ صرف اپنے لیے معیوب سمجھتے ہیں بلکہ یہ فریضہ سرانجام دینے والے کو اس کام سے منع کرتے ہیں اور اپنے مقدور بھر روکنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ ہمارا دوسرا المیہ یہ ہے کہ اگر کچھ لوگ یہ فریضہ سرانجام دینے کے لیے کمر بستہ ہوتے ہیں تو پھر وہ داروغہ بن بیٹھتے ہیں حالانکہ اللہ نے اس کی اجازت اپنے حبیب ﷺ کو بھی نہیں دی تھی۔ ان دونوں انتہائی (Extereme) رویوں کی بنیادی وجہ ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ اس فریضے کو سرانجام دینے کے لیے قرآن وحدیث کا مطلوبہ متوازن طرز عمل ہمارے ذہنوں سے اوجھل ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم میں سے جو لوگ اس کو فرض سمجھتے بھی ہیں تو انہوں نے اس کو فرض کفایہ یعنی مولوی لوگوں کی ذمہ داری قرار دے کر خود کو فارغ کر لیا ہے۔ حالانکہ یہ فرض عین ہے یعنی فرداً فرداً ہر شخص پر اس کے ظروف واحوال کے مطابق فرض ہے۔ اسی ذہنی خلا کو پر کرنے کی نیت سے کچھ عرصہ پہلے فاؤنڈیشن کے میگزین میں شائع ہونے والے چند مضامین کو یکجا کر کے ''اصلاحِ معاشرہ'' کے عنوان سے شائع کر کے تقسیم کیا گیا تھا پھر اسے جینے کا سلیقہ کورس میں شامل کر دیا گیا۔ جن طلبا کے پاس یہ کتابچہ نہیں ہے وہ اپنے رول نمبر کے حوالے سے یہ کتابچہ بلا معاوضہ طلب کر لیں۔

اس ضمن میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اوپر معارف القرآن کی عبارت میں کہا گیا ہے کہ اس فریضہ سے پہلو تہی کرنا اپنی نجات کا راستہ بند کرنا ہے۔ یہاں نجات کا مطلب یہ ہے کہ بندے کو میدان حشر سے براہِ راست جنت میں داخلے کا پروانہ نصیب ہو جائے۔ اس میں اس عقیدے کی نفی نہیں ہے کہ گنہگار اہل ایمان اپنے گناہوں کے بمقدار سزا بھگتنے کے بعد دوزخ سے نکال لیے جائیں گے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الھمزۃ (104)

آیت نمبر (1 تا 9)

ترکیب

(آیات۔ 1 تا 4) هُمَزَةٌ۔ لُمَزَةٌ۔ حُطَمَةٌ یہ تینوں الفاظ اسمائے صفت ہیں اور ان تینوں پر تائے مبالغہ ہے۔ (آیت۔ 3) اَنَّ کا اسم مَالَهٗ ہے اس لیے یہ حالت نصب میں ہے اور یہ اَخْلَدَ کا فاعل ہے۔ اس سے متصل ہٗ کی ضمیر مفعولی گزشتہ آیت میں اَلَّذِیْ کے لیے ہے۔
(آیت۔ 6) نَارُ اللّٰهِ خبر ہے۔ اَلْمُوْقَدَةُ۔ نَارُ کی صفت ہے اس لیے اس پر تائے تانیث ہے۔ اس خبر کا مبتداھِیَ محذوف ہے۔
(آیت۔ 8) اِنَّ کا اسم اس کے ساتھ هَا کی ضمیر ہے جو نَارٌ کے لیے ہے۔ مُؤْصَدَةٌ اس کی خبر ہے اس لیے اس پر تائے تانیث ہے۔
(آیت۔ 9) فِیْ عَمَدٍ متعلق خبر ہے اِنَّهَا کی اور مُمَدَّدَةٍ صف ہے عَمَدٍ، جو جمع مکسر ہے۔ اس لیے اس کی صفت واحد مؤنث آئی ہے۔

ترجمہ

2050

وَيۡلٌ لِّكُلِّ	هُمَزَةٍ	لُّمَزَةِ ۨ ﴿۱﴾	الَّذِىۡ جَمَعَ مَالًا
تباہی ہے ہر ایک	بہت طعنہ زنی کرنے والے	بہت عیب جوئی کرنے والے کے لیے	جس نے جمع کیا کچھ مال

وَّعَدَّدَهٗ ﴿۲﴾	يَحۡسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ	اَخۡلَدَهٗ ﴿۳﴾	كَلَّا لَيُنۡۢبَذَنَّ
اور وہ بار بار گنتا رہا اس کو	وہ گمان کرتا ہے کہ اس کا مال	دوام بخشے گا اس کو	ہرگز نہیں! اُس (شخص) کو لازماً پھینکا جائے گا

فِى الۡحُطَمَةِ ﴿۴﴾	وَمَاۤ اَدۡرٰٮكَ	مَا الۡحُطَمَةُ ﴿۵﴾	نَارُ اللّٰهِ الۡمُوۡقَدَةُ ﴿۶﴾
اُس بہت روندنے والی میں	اور تو نے کیا سمجھا	کیا ہے وہ بہت روندنے والی	(وہ) اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے

الَّتِىۡ تَطَّلِعُ عَلَى الۡاَفۡـِٕدَةِ ﴿۷﴾	اِنَّهَا عَلَيۡهِمۡ	مُّؤۡصَدَةٌ ﴿۸﴾	فِىۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ﴿۹﴾
جو چڑھتی ہے دلوں پر	بیشک وہ (آگ) ان پر	اوپر سے بند کی ہوئی ہے	دراز کیے ہوئے ستونوں میں

نوٹ:1

سابق سورۃ العصر اور اس سورہ کے مضمون میں نہایت واضح مناسبت یہ ہے کہ سابق سورہ میں فلاح پانے والے انسانوں کا کردار بیان ہوا ہے اور اس سورہ میں اس کے بالکل ضد کردار بیان ہوا ہے جو روپیہ گن گن کر رکھتے ہیں اور لوگوں کے حقوق ادا کرنا تو درکنار، کسی کو اگر دیکھ پائیں کہ وہ ادائے حقوق کے معاملے میں عملاً و قولاً سرگرم ہے تو اپنے طعن و طنز سے اسے تنگ کرتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح اس کا حوصلہ پست کر دیں تاکہ ان کی بخالت پر پردہ پڑا رہے اور ان کو خفت و ندامت سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ قرآن نے بخیل سرمایہ داروں کے اس کردار کی طرف جگہ جگہ اشارہ کیا ہے۔ مثلاً سورۂ توبہ کی آیت۔ 79۔ میں ہے۔ ’’جو لوگ خوش دلی سے انفاق کرنے والے اہل ایمان پر ان کے صدقات کے باب میں نکتہ چینی کرتے ہیں اور جو غریب اپنی محنت مزدوری سے انفاق کرتے ہیں، ان پر پھبتیاں چست کرتے ہیں، اللہ نے ان لوگوں کا مذاق اڑایا اور ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔‘‘ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:2

اس سورہ کو اگر ان سورتوں کے تسلسل میں رکھ کر دیکھا جائے جو سورہ زلزال سے یہاں تک چلی آ رہی ہیں تو آدمی بڑی اچھی طرح یہ سمجھ سکتا ہے کہ مکہ معظّمہ کے ابتدائی دور میں کس طریقے سے اسلام کے عقائد اور اس کی تعلیمات کو لوگوں کے ذہن نشین کیا گیا تھا۔ سورۂ زلزال میں بتایا گیا کہ کوئی ذرہ برابر نیکی یا بدی ایسی نہ ہوگی جو اس نے دنیا میں کی ہو اور وہ آخرت میں اس کے سامنے نہ آ جائے۔ سورہ عادیات میں اس کشت و خون اور غارت گری کی طرف اشارہ کیا گیا جو عرب میں ہر طرف برپا تھی۔ پھر یہ احساس دلانے کے بعد کہ خدا کی دی ہوئی طاقتوں کا یہ استعمال اس کی بہت بڑی ناشکری ہے، لوگوں کو بتایا گیا کہ یہ معاملہ اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جائے گا بلکہ موت کے بعد دوسری زندگی میں صرف افعال ہی کی نہیں بلکہ نیتوں تک کی جانچ پڑتال ہوگی۔ سورۂ قارعہ میں قیامت کا نقشہ پیش کرنے کے بعد لوگوں کو خبردار کیا گیا کہ آخرت میں انسان کے انجام کا انحصار اس پر ہوگا کہ اس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہے یا ہلکا۔ سورۂ تکاثر میں اس ذہنیت پر گرفت کی گئی جس کی وجہ سے لوگ مرتے دم تک دنیا کے عیش و آرام اور جاہ و منزلت میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ پھر اس کے بُرے انجام سے آگاہ کیا گیا کہ ایک ایک نعمت جو یہاں تمہیں مل رہی ہے اس کے لیے تمہیں اپنے رب کو جواب دینا ہوگا کہ اسے کیسے حاصل کیا اور کہاں استعمال کیا۔ سورۂ عصر میں بتا دیا گیا کہ نوع انسانی کا ایک ایک فرد خسارے میں ہے اگر اس میں مذکورہ چار صفات نہ ہوں۔ اس کے بعد یہ سورہ آئی ہے جس

میں جاہلیت کی سرداری کا ایک نمونہ پیش کر کے لوگوں کے سامنے گویا یہ سوال رکھ دیا گیا کہ یہ کردار خسارے میں کیوں نہ ہو۔ (تفہیم القرآن)۔ 4050

نوٹ:3 آیت۔3۔ کا ایک مطلب یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے حیاتِ جاوداں بخش دے گا یعنی دولت جمع کرنے اور اسے گن گن کر رکھنے میں وہ ایسا منہمک ہے کہ اسے اپنی موت یاد نہیں رہی اور اسے کبھی یہ خیال بھی نہیں آتا کہ ایک وقت یہ سب کچھ چھوڑ کر خالی ہاتھ دنیا سے رخصت ہونا ہے۔

آیت۔7۔ میں اَلۡاَفۡـِٕدَۃِ کا لفظ آیا ہے جو فواد کی جمع ہے اور جس کے معنی دل کے ہیں۔ لیکن یہ لفظ اس عضو کے لیے استعمال ہوتا ہے جو انسان کے شعور وادراک، جذبات وخواہشات، عقائد وانکار اور نیتوں اور ارادوں کا مقام ہے۔ دلوں تک اس آگ کے پہنچنے کا ایک مطلب یہ ہے کہ یہ آگ اس جگہ تک پہنچے گی جو انسان کے فاسد عقائد اور ناپاک خواہشات وجذبات کا مرکز ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی وہ آگ دنیا کی آگ کی طرح اندھی نہیں ہوگی کہ مستحق اور غیر مستحق سب کو جلا دے بلکہ وہ ایک ایک مجرم کے دل تک پہنچ کر ہر ایک کو اس کے جرم کے مطابق عذاب دے گی۔ (تفہیم القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الفیل (105)

آیت نمبر (1تا5)

اَلَمۡ تَرَ	کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ	بِاَصۡحٰبِ الۡفِیۡلِ ؕ﴿۱﴾	اَلَمۡ یَجۡعَلۡ کَیۡدَہُمۡ
کیا تو نے غور نہیں کیا	کیسا کیا تیرے رب نے	ہاتھی والوں کے ساتھ	کیا اس نے نہیں کیا ان کے داؤ کو

فِیۡ تَضۡلِیۡلٍ ۙ﴿۲﴾	وَّ اَرۡسَلَ عَلَیۡہِمۡ طَیۡرًا	اَبَابِیۡلَ ۙ﴿۳﴾
تباہ کرنے میں	اور اس نے بھیجے ان لوگوں پر کچھ پرندے	جھنڈ در جھنڈ ہوتے ہوئے

تَرۡمِیۡہِمۡ	بِحِجَارَۃٍ مِّنۡ سِجِّیۡلٍ ۪ۙ﴿۴﴾	فَجَعَلَہُمۡ کَعَصۡفٍ مَّاۡکُوۡلٍ ﴿۵﴾
جو پھینکتے تھے ان پر	کچھ پتھر مٹی کے پتھر میں سے	پھر اس نے کر دیا ان کو کھائے ہوئے بھوسے کی مانند

نوٹ:1 سورہ بروج کے نوٹ۔2۔ میں بیان کیا جا چکا ہے کہ یمن کے بادشاہ نے اللہ پر ایمان لانے والے عیسائیوں کو آگ میں زندہ جلا دیا تھا۔ اس ظلم کا بدلہ لینے کے لیے حبشہ کی عیسائی حکومت نے یمن پر حملہ کر دیا اور 525ء میں اس پورے علاقے پر حبشی حکومت قائم ہو گئی تھی یمن پر جو حبشی فوج حملہ آور ہوئی تھی اس کے دو سردار اریاط اور ابرہہ بعد میں آپس میں لڑ پڑے مقابلہ میں اریاط مارا گیا اور ابرہہ ملک پر قابض ہو گیا۔ یمن میں پوری طرح اپنا اقتدار مضبوط کر لینے کے بعد ابرہہ نے اس مقصد کے لیے کام شروع کیا جو ابتدا سے رومی سلطنت اور حبشی عیسائیوں کے پیش نظر تھا۔ یعنی عرب میں عیسائیت پھیلانا اور اس کی تجارت پر قبضہ کرنا جو بلادِ مشرق (یعنی انڈونیشا،

ہندوستان وغیرہ) اور رومی مقبوضات کے درمیان عربوں کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے یمن کے دارالحکومت صنعا میں ایک عظیم الشان کلیسا (گرجا گھر) تعمیر کرایا۔ اس کی تکمیل کے بعد اس نے حبشہ کے بادشاہ کو لکھا کہ میں عربوں کا حج کعبہ سے اس کلیسا کی طرف موڑے بغیر نہ رہوں گا۔ اس نے یمن میں علی الاعلان اپنے اس ارادے کا اظہار کیا اور اس کی منادی کرادی۔ اس پر کسی عرب یا قریشی نے یا چند قریشی نوجوانوں نے مشتعل ہو کر کلیسا کو گندا کر دیا یا اس کو آگ لگائی۔ لیکن یہ بھی کچھ بعید نہیں کہ ابرہہ نے خود اپنے کسی آدمی سے ایسی کوئی حرکت کروائی ہو تا کہ اسے مکہ پر حملہ کرنے کا بہانہ مل جائے۔ بہرحال اس واقعہ کے بعد اس نے کعبہ کو ڈھا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء میں وہ ساٹھ ہزار فوج اور تیرہ ہاتھی لے کر مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں دو عرب سرداروں نے اپنے اپنے لشکر جمع کر کے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر دونوں کو شکست ہوئی۔

2050

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ یہ لشکر جب عرفات کے قریب پہنچا تو حضرت عبدالمطلب اس کے پاس گئے اور کہا کہ آپ کو یہاں تک آنے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ کو اگر کوئی چیز مطلوب تھی تو ہمیں کہلا بھیجتے ہم اسے لے کر خود آپ کے پاس حاضر ہو جاتے۔ اس نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ یہ گھر امن کا گھر ہے، میں اس کا امن ختم کرنے آیا ہوں۔ حضرت عبدالمطلب نے کہا کہ یہ اللہ کا گھر ہے اور اس نے آج تک کسی کو اس پر مسلط نہیں ہونے دیا ہے۔ ابرہہ نے کہا ہم اس کو منہدم کیے بغیر نہیں پلٹیں گے۔ حضرت عبدالمطلب نے کہا کہ آپ جو کچھ چاہیں لے لیں اور واپس چلے جائیں۔ مگر ابرہہ نے انکار کر دیا اور اپنے لشکر کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں اونٹوں کے قصے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

یہ امر بالکل واضح ہے کہ مکہ اور اس کے آس پاس کے قبائل اتنی بڑی فوج سے لڑ کر کعبے کو بچانے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ اس لیے یہ بالکل قابل فہم بات ہے کہ قریش نے اس کی مزاحمت کی کوئی کوشش نہ کی۔ ابرہہ کے لشکر سے واپس آ کر حضرت عبدالمطلب نے قریش والوں سے کہا کہ اپنے بال بچوں کو لے کر پہاڑوں میں چلے جائیں تا کہ ان کا قتل عام نہ ہو جائے۔ پھر وہ قریش کے چند سرداروں کو لے کر حرم میں حاضر ہوئے اور کعبے کے دروازے کا کُنڈا پکڑ کر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں کہ وہ اپنے گھر اور اس کے خادموں کی حفاظت فرمائے۔ اس وقت خانۂ کعبہ میں ۳۶۰ بت موجود تھے لیکن اس وقت یہ لوگ ان سب کو بھول گئے اور انہوں نے صرف اللہ کے آگے دست سوال پھیلایا۔ ان کی جو دعائیں تاریخوں میں منقول ہیں ان میں اللہ واحد کے سوا کسی دوسرے کا نام تک نہیں پایا جاتا۔ دعائیں مانگ کر حضرت عبدالمطلب اور ان کے ساتھی بھی پہاڑوں میں چلے گئے۔

دوسرے روز ابرہہ مکہ میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا مگر اس کا خاص ہاتھی محمود، جو آگے آگے تھا یکا یک بیٹھ گیا۔ اس کو بہت تبَر مَارے گئیے، آنکسو سے کچوکے دیئے گئے یہاں تک کہ اسے زخمی کر دیا گیا مگر وہ نہ ہلا۔ اسے کسی اور سمت موڑ کر چلاتے تو وہ دوڑنے لگتا مگر مکہ کی طرف موڑا جاتا تو فوراً بیٹھ جاتا اور کسی طرح آگے بڑھنے کے لیے تیار نہ ہوتا۔ اتنے میں پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ اپنی چونچوں اور پنجوں میں کنکریاں لیے ہوئے آئی اور لشکر پر اِن کی بارش کر دی۔ جس پر یہ کنکر گرتے اس کا جسم گلنا شروع ہو جاتا اور ہڈیاں نکل آتیں۔ خود ابرہہ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ان لوگوں نے یمن کی طرف بھاگنا شروع کیا۔ سب کے سب اسی وقت ہلاک نہیں ہوئے۔ کچھ تو وہیں ہلاک ہوئے اور کچھ بھاگتے ہوئے راستے بھر گرتے چلے گئے، ابرہہ بھی خشعم کے علاقے میں پہنچ کر مرا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں عرب کے دوسرے سردار نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حبشیوں کو صرف یہی سزا دینے پر اکتفا نہ کیا بلکہ تین چار سال کے اندر یمن سے حبشی اقتدار ہمیشہ

کے لیے ختم کر دیا۔ واقعہ فیل کے بعد یمن میں ان کی طاقت ٹوٹ گئی۔ جگہ جگہ یمنی سردار علم بغاوت لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک یمنی سردار نے شاہ ایران سے فوجی مدد طلب کر لی۔ ایران سے صرف ایک ہزار فوج چھ جہازوں کے ساتھ آئی تھی جو حبشی حکومت کا خاتمہ کر دینے کے لیے کافی ہوگئی۔ یہ ۵۷۵ء کا ہے۔

2050

یہ اتنا بڑا واقعہ تھا جس کی تمام عرب میں شہرت ہوگئی۔ بہت سی شعراء نے قصائد کہے۔ ان تمام قصائد میں یہ بات بالکل نمایاں ہے کہ سب نے اسے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اعجاز قرار دیا اور کہیں اشارہ و کنایۃً بھی یہ نہیں کہا کہ اس میں ان بتوں کا بھی کوئی دخل تھا جو کعبہ میں پوجے جاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قریش نے دس سال تک اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کسی کی عبادت نہ کی۔ جس سال یہ واقعہ پیش آیا اہل عرب اسے عام الفیل کہتے ہیں۔ اور اسی سال رسول اللہ ﷺ کی ولادتِ مبارکہ ہوئی۔ محدثین اور مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ واقعہ محرم میں پیش آیا تھا اور حضور ﷺ کی ولادت ربیع الاوّل میں ہوئی تھی۔ اکثریت یہ کہتی ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت واقعہ فیل کے پچاس دن بعد ہوئی۔

جو تاریخی واقعات اوپر دیئے گئے ہیں ان کو نگاہ میں رکھ کر سورۂ فیل پر غور کیا جائے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اس سورہ میں اس قدر اختصار کے ساتھ صرف اصحاب فیل پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا ذکر کر دینے پر کیوں اکتفا کیا گیا۔ واقعہ کچھ پرانا نہ تھا اور مکہ کا بچہ بچہ اس کو جانتا تھا۔ تمام اہل عرب اس بات کے قائل تھے کہ ابرہہ کے حملے سے کعبے کی حفاظت کسی دیوی دیوتا نے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے کی تھی۔ قریش کے سرداروں نے اللہ ہی سے مدد کے لیے دعائیں مانگی تھیں۔ پھر اس واقعہ سے وہ اس قدر متاثر رہے کہ کئی سالوں تک انہوں نے اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی تھی۔ اس لیے سورۂ فیل میں تفصیلات کے ذکر کے بجائے صرف اس واقعہ کو یاد دلا دینا کافی تھا تاکہ قریش کے لوگ خصوصاً اور اہل عرب عموماً سوچیں کہ محمد ﷺ جس چیز کی طرف دعوت دے رہے ہیں وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ دوسرے تمام معبودوں کو چھوڑ کر صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کی جائے۔ (تفہیم القرآن۔ ج ۶۔ ص ۴۶۲ تا ۴۶۹ سے ماخوذ)۔

نوٹ:2

آیت۔ ۲۔ میں لفظ کید استعمال کیا گیا ہے جو کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے خفیہ تدبیر کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہاں کیا چیز خفیہ تھی۔ ابرہہ ساٹھ ہزار کا لشکر ہاتھیوں کے دستے کے ساتھ لے کر اعلانیہ یمن سے مکہ آیا تھا اور اس نے یہ بات چھپا کر نہیں رکھی تھی کہ وہ کعبہ کو ڈھانے آیا ہے۔ اس لیے یہ تدبیر تو خفیہ نہ تھی۔ البتہ اس اعلانیہ کاروائی کے پیچھے جو نیت تھی وہ خفیہ تھی اور وہ حبشیوں کی یہ غرض تھی کہ وہ کعبہ کو ڈھا کر اور تمام اہل عرب کو مرعوب کر کے تجارت کا وہ راستہ عربوں سے چھین لینا چاہتے تھے جو جنوبِ عرب سے شام و مصر کی طرف جاتا تھا۔ اس مقصد کو انہوں نے چھپا کر رکھا تھا اور ظاہر یہ کیا تھا کہ ان کے کلیسا کی جو بے حرمتی عربوں نے کی ہے اس کا بدلہ وہ ان کا معبد ڈھا کر لینا چاہتے ہیں۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3

ابابیل کا لفظ جمع کا ہے مگر اس کا کوئی مفرد (واحد) مستعمل نہیں ہے۔ اس کے معنی پرندوں کے غول کے ہیں اور یہ کسی خاص پرندے کا نام نہیں ہے۔ اردو میں ایک خاص چڑیا کو ابابیل کہتے ہیں، یہاں وہ مراد نہیں ہے بلکہ یہ پرندے عجیب طرح کے تھے جو اس سے پہلے نہیں دیکھے گئے تھے۔ جسامت میں کبوتر سے چھوٹے تھے اور ان کے پنجے سرخ تھے۔ یہ کوئی ایسی جنس تھی جو پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی اور نہ بعد میں دیکھی گئی۔ (معارف القرآن)۔

2050

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ(107)

آیت نمبر(1تا4)

ترکیب

(آیت۔1) اِیۡلٰفٌ باب افعال کا مصدر ہے۔اس پر حروف جارہ کا لِ داخل ہوا جس نے اس کو جرّ دی ہے اور مضاف ہونے کی وجہ سے اس کی تنوین ختم ہوئی ہے۔ قُرَیۡشٍ اس کا مضاف الیہ ہے۔ بات کا مرکب جاری سے شروع ہونا تقاضا کرتا ہے کہ اس سے پہلے کچھ محذوف مانا جائے۔ چنانچہ مفسرین کے ایک گروہ نے پچھلی سورت کے ساتھ معنوی تعلق کی بنا پر یہاں اِنَّ اَهۡلَکۡنَاهُمۡ یا اِنَّا اَهۡلَکۡنَا اَصۡحٰبَ الۡفِیۡلِ کو محذوف مانا ہے۔ دوسرے گروہ نے اس کا تعلق اس جملہ سے مانا ہے جو آگے آ رہا ہے یعنی فَلۡیَعۡبُدُوۡا ہم پہلی رائے کو ترجیح دیں گے۔ (آیت۔2) اٖلٰفِهِمۡ میں اِیۡلٰفِ کی جرّ بتارہی ہے کہ پچھلے مرکب جارّی لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ کا بدل ہے اِیۡلٰفٌ دو مفعول کا تقاضہ کرتا ہے۔ کس کو مانوس کیا اور کس چیز سے مانوس کیا۔ یہاں اِیۡلٰفِ کا مفعول اول هِمۡ کی ضمیر ہے اور رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیۡفِ مفعول ثانی ہے۔

ترجمہ

الشِّتَآءِ	رِحۡلَةَ	اٖلٰفِهِمۡ	لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ ۙ﴿۱﴾
سردی کے	سفر سے	ان کو مانوس کرنا	(ہم نے ہلاک کیا اصحاب فیل کو) قریش کو مانوس کرنے کے واسطے

الَّذِیۡۤ اَطۡعَمَهُمۡ	رَبَّ هٰذَا الۡبَیۡتِ ۙ﴿۳﴾	فَلۡیَعۡبُدُوۡا	وَالصَّیۡفِ ۚ﴿۲﴾
وہ جس نے کھانے کو دیا ان کو	اس گھر کے مالک کی	تو چاہیے کہ یہ لوگ بندگی کریں	اور گرمی کے

مِّنۡ خَوۡفٍ ﴿۴﴾	وَّ اٰمَنَهُمۡ	مِّنۡ جُوۡعٍ ۬ۙ
خوف میں	اور جس نے امن دیا ان کو	بھوک میں

نوٹ:1

اس پر تو مفسرین کا اتفاق ہے کہ معنی اور مضمون کے اعتبار سے یہ سورت سورۂ فیل ہی سے متعلق ہے اور شاید اسی وجہ سے بعض مصاحف میں ان دونوں کو ایک ہی سورت کے طور پر لکھا گیا تھا اور ان کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھی گئی تھی مگر حضرت عثمان ؓ نے جب تمام مصاحف قرآن کو جمع کر کے ایک نسخہ تیار فرمایا اور تمام صحابہ کرام ؓ کا اس پر اجماع ہوا، تو اس میں ان دونوں کو الگ الگ سورتوں کے طور پر لکھا گیا اور دونوں کے درمیان بسم اللہ لکھی گئی۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:2

اس سورہ کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس تاریخی پس منظر کو نگاہ میں رکھا جائے جس سے اس سورہ کے مضمون اور سورۂ فیل کے مضمون کا گہرا تعلق ہے۔

قریش کا قبیلہ نبی ﷺ کے جد اعلیٰ قُصَیّ بن کلاب کے زمانے تک حجاز میں منتشر تھا۔ قُصَیّ نے ان کو مکہ میں جمع کیا اور بیت اللہ کا انتظام اس قبیلہ کے ہاتھ آ گیا۔ اس نے اطراف عرب سے آنے والے حاجیوں کی خدمت کا بہترین انتظام کیا۔ قُصَیّ کے بعد اس کے بیٹوں عبد مناف اور عبد الدّار کے درمیان یہ انتظامات تقسیم ہوگئے۔ عبد مناف کے چار بیٹے تھے۔ ان میں ہاشم، حضرت عبد المطلب کے والد اور رسول اللہ ﷺ کے پردادا تھے۔ ہاشم کو سب سے پہلے یہ خیال آیا کہ اس بین الاقوامی تجارت میں حصہ لیا جائے جو شام و مصر اور بلادِ مشرق (یعنی ہندوستان، انڈونیشا وغیرہ) کے درمیان ہو رہی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایران کی حکومت اس

تجارتی راستے پر قابض ہو چکی تھی جو شمالی علاقوں اور خلیج فارس کے راستے سے رومی سلطنت اور بلادِ مشرق کے درمیان ہوتی تھی۔اس لیے جنوبی عرب سے بحر احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ جو تجارتی راستہ شام و مصر کی طرف جاتا تھا، اس کا کاروبار بہت چمک اٹھا تھا۔ دوسرے تجارتی قافلوں کی بہ نسبت قریش کو یہ سہولت حاصل تھی کہ راستے کے تمام قبائل بیت اللہ کے خادم ہونے کی حیثیت سے ان کا احترام کرتے تھے۔ان کے قافلوں پر ڈاکے نہیں مارتے تھے اور نہ ان سے رہگذر کے وہ بھاری ٹیکس وصول کرتے جو دوسرے قافلوں سے وصول کیا جاتا تھا۔ ہاشم نے انہی تمام پہلوؤں کو دیکھ کر تجارت کی اسکیم بنائی اور اس میں اپنے باقی تین بھائیوں کو شامل کیا۔ یہ اسکیم کامیاب رہی اور ان کی تجارت تیزی سے ترقی کرنے لگی۔

اس تجارت کی وجہ سے قریش کے لوگوں کو شام۔مصر۔عراق۔ایران۔یمن اور حبش کے لوگوں سے تعلقات کے مواقع حاصل ہوئے۔اور مختلف ملکوں کی ثقافت و تہذیب سے براہِ راست سابقہ پیش آنے کے باعث ان کی دانش و بینش کا معیار اتنا بلند ہوتا چلا گیا کہ کوئی دوسرا قبیلہ ان کی ٹکر کا نہ رہا۔ان بین الاقوامی تعلقات کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ عراق سے یہ لوگ وہ رسم الخط لے کر آئے جو بعد میں قرآن مجید لکھنے میں استعمال ہوا۔عرب کے کسی دوسرے قبیلے میں اتنے پڑھے لکھے لوگ نہ تھے جتنے قریش میں تھے۔ یہ حالات تھے جب مکہ پر ابرہہ کی چڑھائی کا واقعہ پیش آیا۔اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو عرب میں قریش ہی کی نہیں خود کعبہ کی دھاک بھی ختم ہو جاتی۔مکہ تک حبشیوں کی پیش قدمی کے بعد رومی سلطنت آگے بڑھ کر شام اور مکہ کے درمیان کا تجارتی راستہ بھی اپنے قبضہ میں لے لیتی اور قریش اس سے زیادہ خستہ حالی میں مبتلا ہو جاتے جس میں وہ قُصَیّ بن کلاب سے پہلے مبتلا تھے۔لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے حبشیوں کی ساٹھ ہزار فوج کو رہا کر دیا اور مکہ سے یمن تک سارے راستے اس فوج کے لوگ گر گر کر مرتے گئے،تو کعبہ کے بیت اللہ ہونے پر تمام اہل عرب کا ایمان پہلے سے بدرجہ زیادہ مضبوط ہو گیا ساتھ ہی قریش کی دھاک بھی ملک بھر میں پہلے سے زیادہ قائم ہو گئی۔

نبی ﷺ کی بعثت کے زمانے میں یہ حالات سب ہی کو معلوم تھے،اس لیے ان کے ذکر کی حاجت نہ تھی۔یہی وجہ ہے کہ اس سورہ کے چار مختصر فقروں میں قریش سے صرف اتنی بات کہنے پر اکتفا کیا گیا کہ جب تم مانتے ہو کہ یہ گھر بتوں کا نہیں بلکہ اللہ کا گھر ہے اور جب تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں اس گھر کی طفیل یہ امن عطا کیا،تمہاری تجارت کو یہ فروغ بخشا اور تمہیں فاقہ زدگی سے بچا کر یہ خوشحالی نصیب کی،تو تمہیں اسی کی عبادت کرنی چاہیے۔(تفہیم القرآن،ج ۶-ص ۴۷۴ تا ۴۷۶ سے ماخوذ)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ الماعون (107)

آیت نمبر (1 تا 7)

ترجمہ

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ	يُكَذِّبُ	بِالدِّيْنِ ①	فَذٰلِكَ	الَّذِيْ
کیا تو نے دیکھا اس کو جو	جھوٹ جانتا ہے	بدلے (کے دن) کو	تو وہ،	وہ ہے جو

يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ②	وَلَا يَحُضُّ	عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ③
دھکا دیتا ہے یتیم کو	اور وہ ترغیب نہیں دیتا (کسی کو)	مسکین کا کھانا (دینے) پر

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۙ④	الَّذِيْنَ هُمْ	عَنْ صَلَاتِهِمْ	سَاهُوْنَ ۙ⑤
توبربادی ہے نمازیوں کے لیے	یہ وہ لوگ ہیں جو	اپنی نماز سے	غافل ہونے والے ہیں

الَّذِيْنَ هُمْ	يُرَآءُوْنَ ۙ⑥	وَيَمْنَعُوْنَ	الْمَاعُوْنَ ⑦ ع
یہ وہ لوگ ہیں جو	ریاکاری کرتے ہیں	اور روکتے ہیں	گھریلواشیاءکو(گردش سے)

نوٹ:1
اس سورہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ آخرت پر ایمان نہ لانا، انسان کے اندر کس قسم کے اخلاق پیدا کرتا ہے۔آیات۔2اور3۔ میں ان کفار کی حالت بیان کی گئی ہے جواعلانیہ آخرت کوجھٹلاتے ہیں۔اور آخری چار آیتوں میں ان منافقین کا حال بیان کیا گیا ہے جو بظاہر مسلمان ہیں مگر دل میں آخرت اور اس کی جزاوسزا کا کوئی تصور نہیں رکھتے۔مجموعی طور پر دوگروہوں کے طرزعمل کو بیان کرنے سے مقصود یہ حقیقت ذہن نشین کرانا ہے کہ انسان کے اندر ایک مستحکم اور پاکیزہ کردار عقیدۂ آخرت کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتا۔(تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2
آیت۔3۔ میں اگر اِطْعَامِ الْمِسْكِيْنِ کہا گیا ہوتا تو معنی یہ ہوتے کہ وہ مسکین کو کھانا کھلانے پر نہیں اکساتا۔لیکن طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ کے معنی یہ ہیں کہ وہ مسکین کا کھانا اس کودینے پر نہیں اکساتا۔اس سے معلوم ہوا کہ جو کھانا مسکین کو دیا جاتا ہے وہ دینے والے کا کھانا نہیں ہے بلکہ اسی مسکین کا کھانا ہے۔یعنی دینے والا کوئی بخشش نہیں دے رہا ہے بلکہ مسکین کا حق ادا کررہا ہے۔(تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3
آیت۔4۔5۔ کے متعلق حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے فِيْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ نہیں فرمایا بلکہ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ فرمایا ہے۔ہم نماز میں بھولتے تو ضرور ہیں مگر نماز سے غافل نہیں ہیں۔اس لیے ہمارا شمار منافقوں میں نہیں ہوگا۔حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے ان کے صاحبزادے مصعب بن سعد نے پوچھا کہ آپ نے اس آیت پر غور فرمایا کیا اس کا مطلب نماز چھوڑ دینا ہے یا اس سے مراد نماز پڑھتے ہوئے خیال کسی اور طرف چلا جانا ہے۔خیال ہٹ جانے کی حالت ہم میں سے کس پر نہیں گزرتی۔حضرت سعدؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد نماز کے وقت کو ضائع کرنا اور اسے وقت ٹال کر پڑھنا ہے۔(تفہیم القرآن)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ الکوثر(108)

آیت نمبر(1تا3)

ن ح ر

(ف) نَحْرًا — گلے میں چوٹ لگانا۔ذبح کرنا۔
اِنْحَرْ — فعل امر ہے۔توذبح کر۔قربانی کر۔زیرمطالعہ آیت۔2۔

ب ت ر

(ن) بَتْرًا — کاٹنا۔اللہ کا کسی کو بے اولاد کرنا۔کسی کی نسل کو کاٹنا۔
(س) بَتَرًا — کٹ جانا۔بے اولاد ہونا۔نسل کٹا ہونا۔

اَبْتَرُ — اَفْعَلُ کا وزن ہے بے اولاد۔نسل کٹا۔جس کی موت کے بعد اس کا خلف یعنی نام لیوا کوئی نہ ہو، نہ اولاد ہو اور نہ رشتہ دار یا احباب میں کوئی نام لیوا ہو زیر مطالعہ آیت۔3۔(ایسا لگتا ہے کہ یہ لفظ افعال الوان وعیوب اور افعل تفضیل، دونوں کے مفاہیم کا جامع ہے۔بے اولاد یا نسل کٹا ہونا، الوان وعیوب کا مفہوم ہے اور کوئی خلف نہ ہونا۔افعل وتفضیل کا مفہوم ہے)۔

ترجمہ

اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰکَ	الۡکَوۡثَرَ ﴿۱﴾	فَصَلِّ لِرَبِّکَ
بیشک ہم نے عطا کی آپؐ کو	بے انتہا (خیر)	تو آپؐ نماز پڑھیں اپنے رب کے لیے

وَانۡحَرۡ ﴿۲﴾	اِنَّ شَانِئَکَ	ھُوَ الۡاَبۡتَرُ ﴿۳﴾
اور آپؐ اونٹ قربان کریں	بیشک آپؐ سے بغض رکھنے والا	ہی بالکل بے نام ونشان ہے

نوٹ:1

کوثر کے معنی ہیں بہت زیادہ بھلائی اور بہتری۔یہاں اس سے کیا چیز مراد ہے اس کے متعلق متعدد اقوال ہیں۔ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ اس لفظ کے تحت ہر قسم کی دینی و دنیوی اور حسی و معنوی نعمتیں داخل ہیں جو آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے طفیل اس اُمت کو ملنے والی تھیں۔ان میں سے ایک بہت بڑی نعمت وہ حوض کوثر ہے جس کے پانی سے آپ ﷺ اپنی اُمت کو محشر میں سیراب فرمائیں گے۔بعض روایات سے اس کا محشر میں ہونا اور اکثر سے جنت میں ہونا ثابت ہوتا ہے۔علماء نے اس کی تطبیق یوں کی ہے کہ اصل نہر جنت میں ہوگی اور اسی کا پانی میدان حشر میں کسی حوض میں جمع کر دیا جائے گا۔(ترجمہ شیخ الہندؒ)

یہ انتہائی سخت وقت ہوگا جبکہ ہر ایک اَلْعَطَش۔اَلْعَطَش (پیاس پیاس) پکار رہا ہوگا۔اس وقت آپ ﷺ کی اُمت اس حوض پر حاضر ہوگی اور اس سے سیراب ہوگی لیکن کچھ لوگ محروم رہیں گے۔اس کے بارے میں حضور ﷺ نے بار بار اپنے زمانے کے لوگوں کو خبردار کیا کہ میرے بعد تم میں سے جو لوگ بھی میرے طریقے کو بدلیں گے ان کو اس حوض سے ہٹا دیا جائے گا۔میں کہوں گا یہ میرے اصحاب ہیں تو مجھ سے کہا جائے گا کہ آپ ﷺ کو نہیں معلوم کہ آپ کے بعد انہوں نے کیا کیا ہے۔پھر میں ان کو دفع کروں گا اور کہوں گا کہ دور ہو۔یہ مضمون بکثرت روایات میں بیان ہوا ہے۔(بخاری، مسلم، مسند احمد، ابن ماجہ وغیرہ)۔

اسی طرح حضور ﷺ نے اپنے دور کے بعد قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو بھی خبردار کیا ہے کہ ان میں سے جو بھی میرے طریقے سے ہٹ کر چلیں گے اور اس میں رد و بدل کریں گے انہیں اس حوض سے ہٹا دیا جائے گا۔میں کہوں گا کہ اے رب یہ تو میرے ہیں، میری اُمت کے لوگ ہیں۔جواب ملے گا آپ کو نہیں معلوم کہ انہوں نے آپ ﷺ کے بعد کیا کیا تغیرات کیے اور الٹے ہی پھرتے چلے گئے۔پھر میں ان کو دفع کروں گا۔اور حوض پر نہ آنے دوں گا۔اس مضمون کی بہت سی روایات احادیث میں ہیں۔
(بخاری۔مسلم۔مسند احمد۔ابن ماجہ)(تفہیم القرآن۔ج ۶ ص ۴۹۳ تا ۴۹۵ سے ماخوذ)

نوٹ:2

جب حضور ﷺ نبی بنائے گئے اور آپ ﷺ نے قریش کو اسلام کی دعوت دینی شروع کی کہ قریش کے لوگ کہنے لگے کہ محمد (ﷺ) اپنی قوم سے کٹ کر ایسے ہو گئے ہیں جیسے کوئی درخت اپنی جڑ سے کٹ گیا ہو اور کچھ مدت بعد سوکھ کر پیوند خاک ہو جائے۔رسول اللہ ﷺ کی اولاد نرینہ میں بڑے صاحب زادے قاسمؓ تھے اور چھوٹے حضرت عبداللہؓ تھے۔پہلے حضرت قاسمؓ کا انتقال ہوا پھر حضرت عبداللہؓ نے بھی وفات پائی۔اس پر عاص بن وائل نے کہا کہ محمد (ﷺ) ابتر ہیں۔ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے جو ان کا قائم مقام بنے۔جب وہ مر جائیں گے تو ان کا نام دنیا سے مٹ جائے گا اور ان سے تمہارا پیچھا چھوٹ جائے گا۔ایسی ہی باتیں

ابوجہل، عقبہ بن ابی معیط وغیرہ سے بھی منقول ہیں۔ حضور ﷺ کا اپنا چچا، جس کا گھر بالکل آپ ﷺ کے گھر سے ملا ہوا تھا، دوڑتا ہوا مشرکین کے پاس گیا اور ان کو یہ خوشخبری دی کہ آج رات محمد ﷺ کی جڑ کٹ گئی۔ قریش اس لیے آپ ﷺ سے بگڑے تھے کہ آپ ﷺ صرف اللہ ہی کی بندگی کرتے تھے اور ان کے شرک کو آپ ﷺ نے اعلانیہ رد کر دیا تھا۔ اس کی وجہ سے پوری قوم میں جو مرتبہ اور مقام آپ ﷺ کو نبوت سے پہلے حاصل تھا وہ آپ ﷺ سے چھین لیا گیا تھا اور آپ ﷺ گویا برادری سے کاٹ کر پھینک دیئے گئے تھے۔ آپ ﷺ کے چند مٹھی بھر ساتھی سب بے یار و مددگار تھے۔ یہ تھے وہ انتہائی دل شکن حالات جن میں سورۂ کوثر حضور ﷺ پر نازل کی گئی۔ (تفہیم القرآن۔ ج ۶ ص ۴۸۹ تا ۴۹۰ سے ماخوذ)

اس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نبی ﷺ ابتر آپ ﷺ نہیں ہیں بلکہ آپ ﷺ کے یہ دشمن ابتر ہیں۔ یہ قرآن کی اہم پیشینگوئیوں میں سے ایک پیشین گوئی تھی جو حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ اس وقت کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ قریش کے یہ بڑے بڑے سردار کیسے ابتر ہو جائیں گے۔ لیکن چند سالوں میں حالات بالکل پلٹ گئے اور وہ بالکل بے نام نشان ہو گئے۔ آج لاکھوں انسان آپ ﷺ ہی سے نہیں بلکہ آپ ﷺ کے ساتھیوں کے خاندانوں سے اپنی نسبت کو باعث عزت و شرف سمجھتے ہیں۔ کوئی سید ہے، کوئی علوی ہے، کوئی عباسی، ہاشمی، صدیقی، فاروقی، عثمانی، زبیری ہے تو کوئی انصاری ہے۔ مگر نام کو بھی کوئی ابوجہلی یا ابولہبی نہیں پایا جاتا۔ تاریخ نے ثابت کر دیا کہ ابتر حضور ﷺ نہیں بلکہ آپ ﷺ کے دشمن ہی تھے اور ہیں۔ (تفہیم القرآن۔ ج ۶۔ ص ۴۹۷ سے ماخوذ)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الکفرون (109)

آیت نمبر (1 تا 7)

ترجمہ

قُلۡ یٰۤاَیُّہَا الۡکٰفِرُوۡنَ ۙ﴿۱﴾	لَاۤ اَعۡبُدُ	مَا	تَعۡبُدُوۡنَ ۙ﴿۲﴾	وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ
آپ کہہ دیجیے اے کافرو	میں بندگی نہیں کرتا	اس کی جس کی	تم لوگ بندگی کرتے ہو	اور نہ تم لوگ بندگی کرنے والے ہو

مَاۤ	اَعۡبُدُ ۚ﴿۳﴾	وَ لَاۤ اَنَا عَابِدٌ	مَّا عَبَدۡتُّمۡ ۙ﴿۴﴾	وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ
اس کی جس کی	میں بندگی کرتا ہوں	اور نہ (ہی) میں بندگی کرنے والا ہوں	اس کی جس کی تم لوگوں نے بندگی کی	اور نہ تم لوگ بندگی کرنے والے ہو

مَاۤ اَعۡبُدُ ؕ﴿۵﴾	لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ	وَلِیَ دِیۡنِ ٪﴿۶﴾
اس کی جس کی میں بندگی کرتا ہوں	تمہارے لیے تمہارا دین ہے	اور میرے لیے میرا دین ہے

نوٹ: 1

مکہ معظمہ میں ایک دور ایسا گزرا ہے جب نبی ﷺ کی دعوت اسلام کے خلاف قریش کے معاشرے میں مخالفت کا طوفان تو برپا ہو چکا تھا، لیکن ابھی قریش کے سردار اس بات سے بالکل مایوس نہیں ہوئے تھے کہ حضور ﷺ کو کسی نہ کسی طرح مصالحت پر آمادہ کیا جا سکے گا۔ اس لیے وقتاً فوقتاً وہ آپ ﷺ کے پاس مصالحت کی مختلف تجویزیں لے لے کر آتے رہتے تھے تاکہ آپ ﷺ ان میں سے کسی کو مان لیں۔ اس سلسلہ میں متعدد روایات احادیث میں منقول ہوئی ہیں۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہی مجلس میں نہیں بلکہ مختلف اوقات میں مختلف مواقع پر کفار قریش نے اِس قسم کی تجویزیں پیش کی تھیں۔ اور اس بات کی ضرورت تھی کہ ایک ہی دفعہ دوٹوک جواب دے کر

2050

ان کی اس اُمید کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ دین کے معاملہ میں کچھ دو اور کچھ لو کے طریقے پر ان سے کوئی مصالحت کر لیں گے۔

اس پس منظر کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ مذہبی رواداری کی تلقین کے لیے نازل نہیں ہوئی تھی، جیسا کہ آج کل کے بعض لوگ خیال کرتے ہیں، بلکہ اس لیے نازل ہوئی تھی کہ کفار کے دین، ان کی پوجا پاٹ اور ان کے معبودوں سے قطعی براءت کا اعلان کر دیا جائے۔ اور انہیں بتا دیا جائے کہ دین کفر اور دین اسلام ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ ان کے باہم مل جانے کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات اگرچہ ابتداءً قریش نے کفار کو مخاطب کر کے ان کی تجاویز مصالحت کے جواب میں کہی گئی تھی لیکن اسے قرآن مجید میں درج کر کے تمام مسلمانوں کو قیامت تک کے لیے یہ تعلیم دے دی گئی ہے کہ دین کفر جہاں جس شکل میں بھی ہے مسلمانوں کو اس سے براءت کا اظہار کرنا چاہیے۔ (تفہیم القرآن۔ ج ۶۔ ص ۵۰۰۔ ۵۰۱ سے ماخوذ)

نوٹ:2

آیت۔3۔ میں اور۔5۔ میں مَآ اَعْبُدُ آیا ہے۔ عربی زبان میں ما کا لفظ عموماً بے جان یا بے عقل چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور ذی عقل ہستیوں کے لیے مَنْ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اس بنا پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں مَنْ اَعْبُدُ کہنے کے بجائے مَآ اَعْبُدُ کیوں کہا گیا۔ عام طور پر اس کے چار جواب مفسرین نے دیئے ہیں۔ یہ چاروں تاویلات اگرچہ ایک ایک لحاظ سے درست ہیں اور عربی زبان میں ان سب کی گنجائش ہے، لیکن ان میں سے کسی سے بھی وہ اصل مدعا واضح نہیں ہوتا جس کے لیے مَنْ اَعْبُدُ کہنے کے بجائے مَآ اَعْبُدُ کہا گیا ہے۔

دراصل عربی زبان میں کسی شخص کے لیے جب مَنْ کا لفظ استعمال ہو تو اس سے مقصود اس کی ذات کے متعلق کچھ کہنا یا پوچھنا ہوتا ہے۔ اور جب مَا کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے مقصود اس کی صفت کے بارے میں استفسار یا اظہار خیال ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اردو میں جب ہم کہتے ہیں یہ صاحب کون ہیں تو مقصد اس شخص کی ذات سے تعارف حاصل کرنا ہوتا ہے۔ مگر جب ہم کہتے ہیں یہ صاحب کیا ہیں۔ تو اس سے معلوم کرنا مقصود ہوتا ہے کہ وہ شخص کیا کرتا ہے یا اس کے پیشے میں اس کا مقام و منصب کیا ہے۔ مثلاً اگر وہ کسی درسگاہ سے تعلق رکھتا ہے تو کیا وہ لیکچرر ہے۔ پروفیسر ہے کس علم یا فن کا استاد ہے۔ کیا ڈگریاں رکھتا ہے وغیرہ۔ اگر آیت میں یہ کہا جاتا کہ لَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَنْ اَعْبُدُ تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ تم اس ہستی کی عبادت کرنے والے نہیں جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ اس کے جواب میں مشرکین یہ کہہ سکتے تھے کہ اللہ کی ہستی کو تو ہم مانتے ہیں اور ہم اس کی بھی عبادت کرتے ہیں۔ لیکن جب یہ کہا گیا کہ لَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جن صفات کے معبود کی عبادت میں کرتا ہوں ان صفات کے معبود کی عبادت کرنے والے تم نہیں ہو اور یہی وہ اصل بات ہے جس کی بنا پر نبی ﷺ کا دین منکرین خدا (یعنی دہریوں) کے سوا تمام اقسام کے کفار کے دین سے قطعی طور پر الگ ہو جاتا ہے کیونکہ نبی ﷺ کا خدا ان سب کے خدا سے بالکل مختلف ہے۔ ان میں سے کسی کا خدا چھ دن میں دنیا پیدا کرنے کے بعد ساتویں دن آرام کرنے والا ہے۔ حضرت یعقوب سے کشتی لڑتا ہے اور عُزَیر نامی ایک بیٹا رکھتا ہے۔ کسی کا خدا دوسرے کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اپنے اکلوتے بیٹے کو صلیب پر چڑھا دیتا ہے۔ کسی کا خدا بیوی بچے رکھتا ہے مگر اس کے ہاں صرف بیٹیاں پیدا ہوتی ہیں۔ کسی کا خدا انسانی شکل میں روپ دھار کر زمین پر انسانوں کے لیے کام کرتا ہے وغیرہ۔ غرض خدا کو ماننے والے کفار بھی اس خدا کو نہیں مانتے جس کی صفات کی تعلیم قرآن دیتا ہے۔ ان صفات کے معبود کی عبادت محمد ﷺ اور ان کی پیروی کرنے والوں کے سوا دنیا میں کوئی بھی نہیں کر رہا ہے۔ (تفہیم القرآن۔ ج ۶ ص ۵۰۵۔ ۵۰۶ سے ماخوذ)

نوٹ:3 اس سورہ میں کافروں کی طرف سے پیش کی ہوئی مصالحت کی مختلف صورتوں کو بالکل رد کر کے اعلان براءت کیا گیا۔ مگر سورۃ الانفال کی آیت۔۶۱۔ میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ کفار اگر صلح کی طرف جھکیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی جھک جائیے یعنی صلح کر لیجئے اور مدینہ میں یہود سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدۂ صلح مشہور ومعروف ہے۔اس ضمن میں صحیح بات یہ ہے کہ جس قسم کی مصالحت سے اس سورہ میں اعلان براءت کیا گیا وہ جیسے اُس وقت حرام تھی، آج بھی حرام ہے اور جس صورت کی اجازت سورۂ انفال میں آئی ہے اور میثاقِ مدینہ سے عملاً ظاہر ہوئی، وہ جیسے اس وقت جائز تھی آج بھی جائز ہے۔بات صرف موقع محل اور شرائط صلح کو دیکھنے اور سمجھنے کی ہے۔اس کا فیصلہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا ہے جس میں کفار سے معاہدہ کو جائز قرار دینے کے ساتھ ایک استثنا کا ارشاد ہے اِلاَّ صُلۡحًا اَحَلَّ حَرَامًا اَوۡ حَرَّمَ حَلَالًا ۔ یعنی ہر صلح جائز ہے سوائے اس صلح کے جس کی رو سے اللہ کی حرام کی ہوئی کسی چیز کو حلال یا حلال کی ہوئی چیز کو حرام قرار دیا گیا ہو۔(معارف القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ النصر (110)

آیت نمبر (1 تا 3)

ترجمہ

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ	وَالۡفَتۡحُ ۙ﴿۱﴾	وَرَاَیۡتَ النَّاسَ	یَدۡخُلُوۡنَ
جب آئے اللہ کی مدد	اور وہ فتح	اور آپ دیکھیں لوگوں کو	داخل ہوتے ہوئے

فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ۙ﴿۲﴾	فَسَبِّحۡ	بِحَمۡدِ رَبِّکَ
اللہ کے دین میں گروہ در گروہ ہوتے ہوئے	تو آپ تسبیح کریں	اپنے رب کی حمد کے ساتھ

وَاسۡتَغۡفِرۡہُ ؕ	اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا ٪﴿۳﴾
اور آپ مغفرت مانگیں اس سے	بیشک وہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے

نوٹ:1 آیت۔2۔کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ زمانہ رخصت ہو جائے جب ایک ایک دو دو کر کے لوگ اسلام میں داخل ہوتے تھے اور وہ وقت آ جائے جب پورے پورے قبیلے از خود مسلمان ہونے لگیں۔آیت۔3۔کا مطلب ہے کہ اپنے رب کی قدرت کا یہ کرشمہ جب تم دیکھ لو تو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔اس میں حمد کا مطلب یہ ہے کہ اس عظیم کامیابی کے متعلق تمہارے دل میں کبھی یہ خیال نہ آئے کہ یہ تمہارے اپنے کمال کا نتیجہ ہے۔بلکہ اس کو سراسر اللہ کا فضل و کرم سمجھو۔اس پر اس کا شکر ادا کرو اور دل و زبان سے اس کا اعتراف کرو۔تسبیح یعنی سبحان اللہ کہنے میں ایک پہلو تعجب کا بھی ہے۔جب کوئی مُحیّر العقول واقعہ پیش آتا ہے تو آدمی سبحان اللہ کہتا ہے اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ ہی کی قدرت سے ایسا حیرت انگیز واقعہ رونما ہوا ہے ورنہ دنیا کی کسی طاقت کے بس میں یہ نہیں تھا۔

وَاسۡتَغۡفِرۡہُ کا مطلب ہے کہ اپنے رب سے دعا مانگو کہ جو خدمت اس نے تمہارے سپرد کی تھی اس کو انجام دینے میں جو بھول چوک کوتاہی ہوئی ہو، اس سے درگزر فرمائے۔یہ ہے وہ ادب جو اسلام میں بندے کو سکھایا گیا ہے۔کسی انسان سے اللہ کے دین کی کیسی بھی بڑی سے بڑی خدمت انجام پائی ہو اور اس کی عبادت و بندگی میں کتنی بھی محنت اس نے کی ہو، اس کے دل میں کبھی یہ خیال نہ آنا چاہیے کہ میں نے

اپنے رب کا حق ادا کر دیا۔ بلکہ اسے ہمیشہ یہی سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ مجھے کرنا چاہیے تھا وہ میں نہیں کر سکا اور اسے دعا مانگنی چاہیے کہ مجھ سے جو بھی کوتاہی ہوئی ہے اس سے درگزر فرما کر میری حقیر سی خدمت قبول فرمائے۔ (تفہیم القرآن)۔

2050

حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ اس سورت کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ جب کوئی نماز پڑھتے تو یہ دعا کرتے تھے۔

حضرت ام سلمہ ؓ فرماتی ہیں کہ اس سورت کے نزول کے بعد اٹھتے بیٹھتے اور آتے جاتے ہر وقت یہ دعا پڑھتے تھے سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ (معارف القرآن)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ اللھب (111)

آیت نمبر (1 تا 5)

ترکیب

آیت۔1) تَبَّتْ واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے۔ اسی کا فاعل یَدَانِ ہے۔ مضاف ہونے کی وجہ سے نون تثنیہ گرا ہوا ہے۔ تَبَّ واحد مذکر غائب ہے۔ اس کا فاعل اس میں شامل ھُوَ کی ضمیر ہے۔ افعال ماضی میں خبر دینے کا مفہوم بھی ہوتا ہے اور دعا مانگنے کا بھی۔ (دیکھیں آیت۔2/البقرۃ 72، نوٹ۔2) اس آیت کے خبریہ اور دعائیہ، دونوں ترجمے درست مانے جائیں گے۔ ہم دعائیہ کو ترجیح دیں گے۔ (آیت۔2) مَا اَغْنٰی مَا کو نافیہ بھی مانا جا سکتا ہے اور استفہامیہ بھی، دونوں ترجمے درست ہوں گے۔ ہم نافیہ کو ترجیح دیں گے۔ مَا كَسَبَ میں مَا موصولہ ہے آیت۔3) سَيَصْلٰى کا فاعل اس میں شامل ھُوَ کی ضمیر ہے۔ (آیت۔4) وَامْرَاَتُهٗ کی رفع بتا رہی ہے کہ یہ سَيَصْلٰى کا فاعل ثانی ہے۔ اس کا حال ہونے کی وجہ سے حَمَّالَةَ حالتِ نصب میں ہے۔

ترجمہ

تَبَّتْ	يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ	وَّ تَبَّ ؕ ①	مَآ اَغْنٰی عَنْهُ	مَالُهٗ
تباہ ہوں	ابولہب کے دونوں ہاتھ	اور وہ (بھی) تباہ ہو	کام نہ آئے اس کے	اس کا مال

وَمَا	كَسَبَ ؕ ②	سَيَصْلٰى نَارًا	ذَاتَ لَهَبٍ ۚ ③
اور وہ جو	اس نے کمایا	وہ گرے گا ایک ایسی اگ میں جو	شعلے والی ہے

وَّامْرَاَتُهٗ ؕ	حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۚ ④
اور اس کی عورت (بھی)	بہت ہی اٹھانے (لیے پھرنے) والی ہوتے ہوئے لگا بجھائی کو

فِیْ جِيْدِهَا	حَبْلٌ	مِّنْ مَّسَدٍ ۠ ⑤
اس کی گردن میں	ایک ایسی رسی ہے جو	کھجور کے ریشے سے (بٹی) ہے

نوٹ: 1

قرآن مجید میں یہ ایک ہی مقام ہے جہاں دشمنانِ اسلام میں سے کسی شخص کا نام لے کر اس کی مذمت کی گئی ہے حالانکہ مکہ میں بھی اور مدینہ میں بھی بہت سے لوگ ایسے تھے جو اسلام اور محمد ﷺ کی عداوت میں ابولہب سے کس طرح کم نہ تھے۔ سوال یہ

ہے کہ اس شخص کی وہ کیا خصوصیت تھی جس کی بنا پر اس کا نام لے کر اس کی مذمت کی گئی۔ وجہ یہ ہے کہ عربی معاشرے کی اخلاقی قدروں میں صلۂ رحمی کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور قطع رحمی کو بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ عرب کی انہی روایات کا یہ اثر تھا کہ قریش کے دوسرے خاندانوں اور ان کے سرداروں نے تو حضور ﷺ کی شدید مخالفت کی مگر بنو ہاشم نے نہ صرف آپ ﷺ کی مخالفت نہیں کی بلکہ وہ آپ ﷺ کی حمایت کرتے رہے، حالانکہ ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لائے تھے۔ قریش کے دوسرے خاندان اس حمایت کو عرب کی روایات کے عین مطابق سمجھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے کبھی بنو ہاشم کو یہ طعنہ نہیں دیا کہ تم اپنے آبائی دین سے منحرف ہو گئے ہو۔ اس اخلاقی اصول کو صرف ایک شخص نے توڑ ڈالا۔ اور وہ تھا ابولہب جو آپ ﷺ کا سگا چچا تھا۔ یہاں تک کہ نبوت کے ساتویں سال جب قریش نے بنو ہاشم کا معاشرتی اور معاشی مقاطعہ کیا اور بنو ہاشم کے تمام خاندانوں نے رسول اللہ ﷺ کی حمایت پر ثابت قدم رہتے ہوئے شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے تو تنہا یہی ابولہب تھا جس نے اپنے خاندان کا ساتھ دینے کے بجائے قریش کا ساتھ دیا۔ (تفہیم القرآن۔ ج ۶ ص ۵۲۰ تا ۵۲۳ سے ماخوذ۔ اس کے باقی جرائم کی تفصیل ان ہی صفات میں دیکھی جاسکتی ہے)۔

نوٹ: 2

جب رسول اللہ ﷺ پر آیت وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے کوہ صفا پر چڑھ کر قبیلہ قریش کے لوگوں کو آواز دی تو لوگ جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں تمہیں خبر دوں کہ دشمن صبح شام میں تم پر ٹوٹ پڑنے والا ہے تو کیا تم لوگ میری تصدیق کرو گے۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا ہاں ضرور تصدیق کریں گے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں ڈراتا ہوں ایک عذابِ شدید سے۔ یہ سن کر ابولہب نے کہا تَبًّا لَكَ اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا۔ اس آیت۔ ۱۔ میں پہلا جملہ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ بطور بددعا کے ہے یعنی ابولہب ہلاک ہو جائے۔ اور دوسرا جملہ وَتَبَّ خبریہ ہے۔ گویا بددعا کے ساتھ اس کا اثر بھی بتا دیا کہ وہ ہلاک ہو گیا۔ بددعا کا جملہ مسلمانوں کے شفاء غیظ کے لیے ارشاد فرمایا گیا کیونکہ جب ابولہب نے آپ ﷺ کی شان میں تَبًّا کہا تو مسلمانوں کے دل کی خواہش تھی کہ وہ اس کے لیے بددعا کریں۔ حق تعالیٰ نے گویا ان کے دل کی بات خود فرما دی۔ (معارف القرآن)۔

یہاں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں ہے کہ ایک فعل کو دعائیہ اور دوسرے کو خبریہ مانا جائے۔ اس لیے منطقی تقاضا یہ ہے کہ تَبَّتْ، تَبَّ، اور مَآ اَغْنٰى تینوں افعال کو یا تو دعائیہ مانا جائے یا خبریہ۔ ہم نے دعائیہ کو ترجیح دی ہے کیونکہ یہ اس وقت کے اہل ایمان کے دل کی آواز تھی۔ اور جہاں تک دعا کے پورا ہونے کا مسئلہ ہے تو اس وقت بھی آج بھی ہر اہل ایمان کا ایمان ہے کہ اللہ کا فرمان اٹل ہے۔ اس لیے خبر دینے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ (مرتب)۔

نوٹ: 3

كَسَبَ کے معنی ہیں کمانا۔ یعنی وقت، محنت اور اپنے وسائل خرچ کر کے کوئی چیز حاصل کرنا۔ ظاہر ہے اس میں وہ مال بھی آتا ہے جو انسان کماتا ہے، معاشرے میں وہ مقام و مرتبہ بھی جو وہ کوشش کر کے اپنے لیے بناتا ہے، وہ انصار و اعوان بھی جو وہ اپنے تعلقات کے ذریعہ بناتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق آدمی کا بیٹا بھی اس کا کسب ہے۔ یہاں آیت۔ ۲۔ میں مال کا ذکر پہلے آچکا ہے اس لیے وَمَا كَسَبَ میں مال کے علاوہ باقی دوسری کمائیاں مراد ہیں جس میں بیٹے بھی شامل ہیں۔ ابولہب کے انجام سے یہ سب معانی مناسبت رکھتے ہیں۔ کیونکہ بدر کی شکست کے سات روز بعد اس کو طاعون کی گلٹی نکلی جس کو عرب میں عَدَسَہ کہتے ہیں اور جو چھوت کی بیماری ہے۔ اس لیے سب گھر والوں نے اس کو الگ ڈال دیا اور اسی بے کسی کی حالت میں وہ مر گیا۔ تین روز تک لاش پڑی رہی۔ جب سڑنے لگا تو بیٹوں نے مزدوروں سے اٹھوا کر مٹی میں دبوا دیا۔ اس وقت مال، اولاد، تعلقات، کچھ بھی اس کے کام نہ آیا۔

2050

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الاخلاص (112)

آیت نمبر (1 تا 4)

ص م د

(ن۔ض) صَمۡدًا حاجت روائی کے لیے کسی کا قصد کرنا۔رجوع کرنا۔

صَمَدٌ ایسی ہستی جس کی طرف حاجت روائی کے لیے رجوع کیا جائے اور جس کو کسی سے بھی رجوع کرنے کی ضرورت نہ ہو، بے نیاز۔﴿ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۚ﴾ (112 / الاخلاص:2)''اللہ قطعی بے نیاز ہے۔''

ك ف ء

(ف) کَفۡأً لوٹنا۔اعتدال سے متجاوز ہونا۔

(مفاعلہ) مُکَافَئَۃً برابری کرنا۔ہم پلہ ہونے کی کوشش کرنا۔

کُفُوًا برابری والا۔ہم پلہ۔مماثل۔آیت۔112 / البقرۃ:4۔

ترکیب

(آیت۔1) اس کی مختلف ترکیبیں کی گئی ہیں۔ہماری ترجیح یہ ہے کہ ھُوَ ضمیر الشان ہے۔اَللّٰہُ مبتدا اور اَحَدٌ اس کی خبر ہے۔(آیت۔2) اَللّٰہُ مبتدا اور اَلصَّمَدُ اس کی خبر معرفہ ہے۔اس پر جو الف لام ہے اس کو اگر لام تعریف مانیں تو بین السطور مطلب یہ ہوگا کہ متعدد ہستیاں صمد ہیں اور یہاں کسی مخصوص صمد کی بات ہو رہی ہے یہ بات خلاف واقعہ ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ اس پر لام جنس ہے۔(آیت۔4) لَمۡ یَکُنۡ کا اسم اَحَدٌ ہے اس لیے یہ حالت رفع میں ہے۔اور یَکُنۡ کی خبر ہونے کی وجہ سے کُفُوًا حالت نصب میں ہے۔سادہ جملہ یوں ہو سکتا ہے وَلَمۡ یَکُنۡ اَحَدٌ کُفُوًا لَّہٗ۔

ترجمہ

قُلۡ	ھُوَ	اللّٰہُ اَحَدٌ ۚ①	اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۚ②	لَمۡ یَلِدۡ ۙ
آپ کہیے	حقیقت بس یہ ہے کہ	اللہ یکتا ہے	اللہ ہی قطعی بے نیاز ہے	اس نے جنا ہی نہیں

وَلَمۡ یُوۡلَدۡ ۙ③	وَلَمۡ یَکُنۡ	لَّہٗ کُفُوًا	اَحَدٌ ۘ④
اور نہ ہی وہ جنا گیا	اور ہوا ہی نہیں	اس کا مماثل (اس کے جیسا)	کوئی ایک بھی

نوٹ:1

قرآن مجید کی دوسری سورتوں میں بالعموم کسی ایسے لفظ کو ان کا نام قرار دیا گیا ہے جو ان میں وارد ہوا ہو۔لیکن اس سورہ میں لفظ اخلاص کہیں وارد نہیں ہوا۔اس کو یہ نام اس کے معنی کے لحاظ سے دیا گیا ہے جو شخص بھی اس کو سمجھ کر اس کی تعلیم پر ایمان لے آئے گا وہ شرک سے خلاصی پا جائے گا۔جب رسول اللہ ﷺ توحید کی دعوت لے کر اٹھے تھے اس وقت دنیا کے مذہبی تصورات کیا تھے۔(اس کا ایک ہلکا سا جائزہ سورۂ کافرون کے نوٹ۔2۔کے آخر میں دیا ہوا ہے۔مرتب) اس حالت میں جب اللہ وَحدَہٗ لاشریک کو ماننے کی دعوت دی گئی تو لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہونا لازمی تھا کہ وہ رب آخر کس قسم کا ہے کہ تمام معبودوں کو چھوڑ کر تنہا ایک ہی رب اور معبود ماننے کی دعوت دی جا رہی ہے۔

قرآن مجید کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے ان سوالات کا جواب چند الفاظ میں دے کر اللہ کی ہستی کا ایسا واضح

تصور پیش کر دیا جو تمام مشرکانہ تصورات کا قلع قمع کر دیتا ہے اور اس کی ذات کے ساتھ مخلوقات کی صفات میں سے کسی صفت کی آلودگی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہ میں اس سورت کی بڑی عظمت تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں کو اس کی اہمیت محسوس کراتے تھے تاکہ وہ کثرت سے اس کو پڑھیں اور لوگوں میں اسے پھیلائیں۔ احادیث میں کثرت سے یہ روایات بیان ہوئی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو بتایا کہ یہ سورت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔ مفسرین نے اس ارشاد کی بہت سی توجیہات بیان کی ہیں۔ ہمارے نزدیک سیدھی بات یہ ہے کہ قرآن جس دین کو پیش کرتا ہے اس کی بنیاد تین عقیدے ہیں۔ توحید، رسالت اور آخرت۔ یہ سورہ چونکہ خالص توحید کو بیان کرتی ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو ایک تہائی قرآن کے برابر قرار دیا۔ (تفہیم القرآن۔ ج6۔ص530 تا533 سے ماخوذ)

نوٹ:2 ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے اس سورہ سے بڑی محبت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس کی محبت نے تمہیں جنت میں داخل کر دیا۔ ایک طویل حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص صبح اور شام قل ھو اللہ احد اور مُعَوِّذَتَیْنِ (یعنی سورہ فلق اور سورہ الناس) پڑھ لیا کرے تو یہ اس کو ہر بلا سے بچانے کے لیے کافی ہے۔ ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم کو ایسی تین سورتیں بتاتا ہوں کہ جو تورات، انجیل، زبور اور قرآن، سب میں نازل ہوئی ہیں۔ اور فرمایا کہ رات کو اس وقت تک مت سوؤ جب تک ان تین کو نہ پڑھ لو۔ (یعنی مُعَوِّذَتَیْنِ اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ) (معارف القرآن)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الفلق (113)

آیت نمبر (1 تا 5)

و ق ب

(ض) وَقَبَ: آنا۔ جیسے چاند کا گہن میں آنا۔ تاریکی پھیلنا۔ آیت۔ 113 / الفلق :3۔

ن ف ث

(ن۔ض) نَفَثَ: منہ سے تھوڑا سا تھوک نکالنا یا تھوتھو کرنا۔ جادو کے گنڈوں پر پھونک مارنا۔

نَفَّاثٌ: مؤنث نَفَّاثَۃٌ۔ فَعَّالٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔ بار بار یا کثرت سے پھونک مارنے والا۔ آیت۔ 113 / الفلق :4۔

ترجمہ

قُلۡ اَعُوۡذُ	بِرَبِّ الۡفَلَقِ ۙ﴿۱﴾	مِنۡ شَرِّ مَا	خَلَقَ ۙ﴿۲﴾
آپؐ کہیے میں پناہ میں آتا ہوں	صبح کے مالک کی	اس کے شر سے جو	اس نے پیدا کیا

وَمِنۡ شَرِّ غَاسِقٍ	اِذَا وَقَبَ ۙ﴿۳﴾	وَمِنۡ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ
اور اندھیرا کرنے والے (یعنی رات) کے شر سے	جب وہ چھا جائے	اور پھونک مارنے والیوں کے شر سے

إِذَا حَسَدَ ﴿٥﴾	وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ	فِي الْعُقَدِ ﴿٤﴾
جب وہ حسد کرے	اور حسد کرنے والے کے شر سے	گرہوں میں

2050

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ الناس (114)

آیت نمبر (1 تا 6)

ترکیب

اَلْوَسْوَاسِ اور اَلْخَنَّاسِ دونوں اسم المبالغہ ہیں جو ایک طرح سے اسم الصّفہ ہوتے ہیں۔ (دیکھیں آسان عربی گرامر، حصہ سوم پیرا گراف :1:60۔ اس لیے اَلْخَنَّاسِ کو مضاف الیہ اَلْوَسْوَاسِ کی صفت ماننے کی گنجائش نہیں ہے اور اَلْخَنَّاسِ کو شَرِّ کا مضاف الیہ ثانی مانا جائے گا۔ اَلْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ کا موصوف یہاں محذوف ہے۔ آگے آیات۔4۔5۔ میں اسی محذوف موصوف کی وضاحت ہے۔

ترجمہ

مَلِكِ النَّاسِ ﴿٢﴾	بِرَبِّ النَّاسِ ﴿١﴾	قُلْ اَعُوْذُ
انسانوں کے بادشاہ کی	انسانوں کے پروردگار کی	آپؐ کہیے میں پناہ میں آتا ہوں

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ﴿٤﴾	اِلٰهِ النَّاسِ ﴿٣﴾
بار بار وسوسہ اندازی کرنے والے بار بار دبک جانے والے کے شر سے	انسانوں کے حاجت روا، مشکل کشا، پناہ دہندہ کی

مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ﴿٦﴾	فِي صُدُوْرِ النَّاسِ ﴿٥﴾	الَّذِيْ يُوَسْوِسُ
جو جنوں اور انسانوں میں سے ہوتا ہے	انسانوں کے دلوں میں	وہ جو وسوسہ اندازی کرتا ہے

نوٹ:1

سورہ فلق اور سورۂ ناس، یہ دونوں سورتیں ایک ساتھ، ایک ہی واقعہ میں نازل ہوئیں۔ ابن قیمؒ نے ان دونوں سورتوں کی تفسیر یکجا لکھی ہے۔ اس میں فرمایا کہ ان دونوں سورتوں کے منافع اور برکات سے سب لوگوں کی ضرورت ایسی ہے کہ کوئی انسان ان سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔ ان کو سحر، نظر بد اور تمام جسمانی اور روحانی آفات دور کرنے میں تاثیر عظیم حاصل ہے۔ اس کا واقعہ اس طرح ہے کہ نبی کریم ﷺ پر ایک یہودی نے جادو کر دیا تھا جس کے اثر سے آپ ﷺ بیمار ہو گئے تھے۔ جبرئیلؑ نے آکر آپ ﷺ کو اطلاع دی کہ آپ ﷺ پر ایک یہودی نے جادو کیا ہے اور جس چیز پر عمل کیا گیا ہے وہ فلاں کنویں میں ہے۔ آپ ﷺ نے وہاں آدمی بھیجے جو وہ چیز کنویں میں سے نکال لائے۔ اس میں گرہیں لگی ہوئی تھیں۔ آپ ﷺ نے ان گرہوں کو کھول دیا اور آپ ﷺ تندرست ہو گئے۔ جبرئیلؑ نے آپ ﷺ کو اس یہودی کا نام بتا دیا تھا اور آپ ﷺ اس کو جانتے تھے۔ مگر اپنے نفس کے معاملہ میں کسی سے انتقام لیں آپ ﷺ کی عادت نہیں تھی، اس لیے آپ ﷺ نے اس یہودی سے عمر بھر کچھ نہ کہا۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:2

جو لوگ سحر (جادو) کی حقیقت سے ناواقف ہیں ان کو تعجب ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جادو کا اثر کیسے ہوسکتا ہے۔ سحر کی حقیقت اور اس کے اقسام واحکام پوری تفصیل کے ساتھ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں جلد اول صفحہ 217 تا 223 میں بیان کیے جا چکے ہیں،

2050
وہاں دیکھ لیے جائیں۔ یہاں اس کا جو خلاصہ جاننا ضروری ہے وہ اتنا ہے کہ سحر کا اثر بھی طبعی اسباب کا اثر ہوتا ہے۔ جیسے آگ سے جلنا یا گرم ہونا، پانی سے سے سرد ہونا، کسی سبب سے بخار آ جانا یا کسی مرض کا پیدا ہو جانا وغیرہ۔ یہ سب امر طبعی ہیں جن سے انبیاء مستثنیٰ نہیں ہوتے۔ اسی طرح جادو کا اثر بھی اسی قسم سے ہے اس لیے بعید نہیں۔ (معارف القرآن)

اس جادو کے واقعہ میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو آپ ﷺ کے منصب نبوت میں قادح (عیب لگانے والی) ہو۔ ذاتی حیثیت سے اگر آپ ﷺ کو زخمی کیا جا سکتا ہے، اگر آپ ﷺ کو گھوڑے سے گر کر چوٹ لگ سکتی ہے، اگر آپ ﷺ کو بچھو کاٹ سکتا ہے، اور ان میں سے کوئی چیز بھی اس تحفظ کے منافی نہیں ہے جس کا نبوی ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے وعدہ کیا تھا، تو آپ ﷺ اپنی ذاتی حیثیت میں جادو کے اثر سے بیمار بھی ہو سکتے تھے۔ نبی۔ پر جادو کا اثر ہونا تو قرآن مجید سے بھی ثابت ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ فرعون کے جادوگروں نے جو لاٹھیاں اور رسیاں پھینکی تھیں ان کے متعلق عام لوگوں نے ہی نہیں بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی یہی سمجھا کہ وہ ان کی طرف سانپوں کی طرح دوڑی چلی آ رہی ہیں۔ اور اس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام خوفزدہ ہو گئے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل کی کہ خوف نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے۔ اب رہا یہ اعتراض کہ اس طرح تو کفار مکہ کے اس الزام کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ نبی ﷺ کو وہ سحر زدہ آدمی کہتے تھے۔ لیکن یہ اعتراض درست نہیں ہے کیونکہ کفار آپ ﷺ کو سحر زدہ آدمی اس معنی میں نہیں کہتے تھے کہ آپ ﷺ جادو کے اثر سے بیمار ہو گئے ہیں، بلکہ اس معنی میں کہتے تھے کہ کسی جادوگر نے معاذ اللہ آپ کو پاگل کر دیا ہے اور اسی پاگل پن میں آپ نبوت کا دعویٰ کر بیٹھے ہیں۔ اب یہ بات بالکل واضح ہے کہ کفار کا یہ الزام ایسے واقعہ پر سرے سے چسپاں ہی نہیں ہوتا جس کے متعلق تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ جادو کا اثر صرف ذاتِ محمد (ﷺ) پر ہوا تھا، نبوت محمد (ﷺ) اس سے بالکل غیر متاثر رہی۔ (تفہیم القرآن، ج۶ص ۵۵۵۔۵۵۶)

نوٹ:3

ان سورتوں کے معاملہ میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا جھاڑ پھونک کی اسلام میں کوئی گنجائش ہے اور یہ کہ جھاڑ پھونک مؤثر بھی ہے یا نہیں؟ یہ سوال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ بکثرت احادیث میں یہ ذکر آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر رات کو سوتے وقت موذتین (یعنی سورۂ فلق اور سورۂ ناس) یا بعض روایت کے مطابق معوذات (یعنی سورۂ اخلاص اور معوذتین) تین مرتبہ پڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں پر پھونکتے اور پورے جسم پر ہاتھ پھیر لیتے۔

اس معاملہ میں شرعی مسئلہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے ایک طویل حدیث کے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کے وہ لوگ بلا حساب جنت میں داخل ہوں گے جو نہ داغنے کا علاج کراتے ہیں نہ جھاڑ پھونک کراتے ہیں، نہ فال لیتے ہیں بلکہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔ ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے داغنے سے علاج کرایا اور جھاڑ پھونک کرائی، وہ اللہ پر توکل سے بے تعلق ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دس چیزوں کو ناپسند فرماتے تھے جن میں سے ایک جھاڑ پھونک بھی ہے سوائے معوذتین یا معوذات کے۔ بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں حضور ﷺ نے جھاڑ پھونک سے بالکل منع فرما دیا تھا پھر بعد میں اس شرط کے ساتھ اس کی اجازت دے دی کہ اس میں شرک نہ ہو، اللہ کے پاک ناموں یا اس کے کلام سے جھاڑا جائے۔ کلام ایسا ہو جو سمجھ میں آئے اور یہ معلوم کیا جا سکے کہ اس میں کوئی گناہ کی چیز نہیں ہے۔ بھروسہ جھاڑ پھونک پر نہ کیا جائے کہ وہ شفا دینے والی ہے بلکہ اللہ پر بھروسہ کیا جائے کہ وہ چاہے گا تو اسے نافع بنا دے گا۔

2050

ایک مرتبہ نبی ﷺ بیمار ہوئے تو جبرئیلؑ نے آکر پوچھا کہ کیا آپ ﷺ بیمار ہو گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں۔ جبرئیلؑ نے کہا:

بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ	مِنْ كُلِّ شَيْءٍ	يُؤْذِيْكَ	مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ
اللہ کے نام سے میں جھاڑتا ہوں آپ کو	تمام ایسی چیز سے جو	اذیت دے آپ کو	ہر ایک نفس کے شر سے

اَوْ عَيْنٍ حَاسِدٍ	اَللّٰهُ يَشْفِيْكَ	بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ
یا حسد کرنے والے کی آنکھ (کے شر) سے	اللہ شفا دے آپ کو	اللہ کے نام سے میں جھاڑتا ہوں آپ کو

اس کے علاوہ متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے زہریلے جانوروں کے کاٹے، ذباب کے مرض اور نظر بد کے جھاڑنے کی اجازت دی۔ جبکہ دوا سے علاج کرنے کی آپ ﷺ نے تاکید کی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے ہر مرض کی دوا پیدا کی ہے اور تم لوگ دوا کیا کرو۔ آپ ﷺ نے خود بھی لوگوں کو بعض امراض کے علاج بتائے جیسا کہ احادیث میں باب الطب کو دیکھنے سے معلوم ہوسکا ہے۔ لیکن دوا بھی اللہ ہی کے حکم اور اذن سے نافع ہوتی ہے۔ اب اگر دوا سے علاج کرنے کے ساتھ اللہ کے کلام اور اس کے اسماء حسنیٰ سے بھی استفادہ کیا جائے تو یہ بات مادہ پرستوں کے سوا کسی کی عقل کے بھی خلاف نہیں ہے۔ البتہ یہ صحیح نہیں ہے۔ کہ دوا سے علاج کو چھوڑ دیا جائے اور صرف جھاڑ پھونک سے ہی کام لینے پر اکتفا کیا جائے۔ (تفہیم القرآن۔ ج۶۔ ص:۵۷۷ تا ۵۶۰ سے ماخوذ)

نوٹ:4 سورۃ فلق کی آیت۔ ۲۔ میں یہ بات قابل غور ہے کہ شر کو پیدا کرنے کی نسبت اللہ کی طرف نہیں کی گئی بلکہ مخلوقات کی پیدائش کی نسبت اللہ کی طرف اور شر کی نسبت مخلوقات کی طرف کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کو شر کے لیے نہیں پیدا کیا ہے۔ اس کا ہر کام خیر اور کسی مصلحت ہی کے لیے ہوتا ہے۔ البتہ مخلوقات کے اندر جو اوصاف اس نے اس لیے پیدا کیے ہیں کہ ان کی تخلیق کی مصلحت پوری ہو، ان سے بعض اوقات اور بعض اقسام کی مخلوقات سے اکثر شر رونما ہوتا ہے۔

نوٹ:5 قرآن مجید کے آغاز اور اس کے اختتام میں جو مناسبت ہے وہ بھی ذہن میں واضح ہونی چاہیے۔ قرآن کریم کو حق تعالیٰ نے سورۃ فاتحہ سے شروع فرمایا ہے جس کا خلاصہ حق تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد اس کی مدد حاصل کرنا اور اس سے صراطِ مستقیم کی توفیق مانگنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی مدد اور صراطِ مستقیم یہی دو چیزیں ہیں جن میں انسان کی دنیا و دین کے سب مقاصد کی کامیابی مضمر ہے۔ لیکن ان دونوں چیزوں کے حصول میں اور حصول کے بعد ان کے استعمال میں ہر قدم پر شیاطین جن وانس کے مکر و فریب اور وسوسوں کا جال بچھا رہتا ہے۔ اس لیے اس جال کو پاش پاش کرنے کی موثر تدابیر استعاذہ پر قرآن کو ختم کیا گیا۔ (معارف القرآن)۔

دُعَاءُ خَتْمِ الْقُرْاٰنِ

اَللّٰهُمَّ اٰنِسْ	وَحْشَتَنَا	فِيْ قُبُوْرِنَا	اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنَا	بِالْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ
اے اللہ تو مانوس کر دے	ہماری وحشت کو	ہماری قبروں میں	اے اللہ تو رحم کر ہم پر	اس عظیم قرآن (کی برکت) کے سبب سے

وَاجْعَلْهُ لَنَا	اِمَامًا وَّنُوْرًا	وَّهُدًا وَّرَحْمَةً	اَللّٰهُمَّ ذَكِّرْنَا
اور تو بنا دے اس کو ہمارے لیے	پیشوا اور روشنی	اور رہنمائی اور رحمت (کا ذریعہ)	اے اللہ تو یاد دلا دے ہم کو

مِنْهُمَا	نَسِيْنَا	وَعَلِّمْنَا	مِنْهُ مَا	جَهِلْنَا
اس میں سے وہ جو	ہم بھول جائیں	اور تو علم دے ہم کو	اس میں سے اس کا جس سے	ہم ناواقف رہیں

وَارْزُقْنَا	تِلَاوَتَهٗ	اٰنَآءَ الَّيْلِ	وَاٰنَآءَ النَّهَارِ
اور تو عطا کر ہم کو	اس کی تلاوت (کی توفیق)	رات کے وقتوں میں	اور دن کے وقتوں میں

وَاجْعَلْهُ لَنَا	حُجَّةً	يَا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ
اور تو بنا دے اس کو ہمارے لیے	ایک حجت	اے تمام جہانوں کے پالنہار

وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ	اَوَّلًا وَّاٰخِرًا	وَّظَاهِرًا وَّبَاطِنًا	رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا
اور اللہ ہی کے لیے تمام شکر وسپاس ہے	اوّل وآخر میں	اور ظاہر وباطن میں	اے ہمارے رب تو مواخذہ نہ کرنا ہمارا

اِنْ نَّسِيْنَا	اَوْ اَخْطَاْنَا	رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا	اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَظِيْمُ
اگر ہم بھول گئے (کچھ)	یا ہم چوک گئے (کہیں)	اے ہمارے رب تو قبول کر لے ہم سے (یہ ختم قرآن)	بیشک تو ہی سننے والا جاننے والا ہے۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاۃ

اللہ تعالیٰ ہم سب کی یہ سعی قبول فرمائے اور آخرت میں نجات کا ذریعہ بنائے۔ جس جس نے بھی اس کار خیر میں مال، جان اور صلاحیتوں کو لگایا اللہ قبول ومنظور فرمائے

انجمن خدام القرآن فیصل آباد میں اس کے فوٹو کاپی بھی دستیاب ہیں اور محترم ڈاکٹر جہاں زیب صاحب

کے اس کتاب میں اضافہ جات کے ساتھ مطالعہ قرآن حکیم کے نام سے دستیاب ہیں

رابطہ کے لئے: info@khuddam-ul-quran.com www.khuddam-ul-quran.com,

0412437781,0412437618,03217805614

قرآن اکیڈمی سعید کالونی نمبر 2 کینال روڈ فیصل آباد